فکرو نظر

قومی بقاء کی مخدوش صورتِ حال

دھرنے، جلسے جلوس، زندہ باد، مردہ باد کے نعرے، کسی کو اقتدار میں لانے اور کسی کو اتارنے کی مہمیں ......ان چیزوں کا ہماری قومی بقاء، ملی استحکام اور کامیابی وترقی سے کیا تعلق؟ یہ تو مغربی جمہوریت کے اس مکروہ کھیل کا ایک حصہ ہے جو کھلونے کی طرح دے کے ہم بہلائے گئے ہیں۔

قوموں کی ترقی اور کامیابی کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا۔ یہ ایک منزل ہے بہت دور اور راستہ اس کا کٹھن و دشوار......لیکن ان کے لیے نہیں جو در بغل دارند کتاب۔ خوش قسمت ہے وہ قوم جس کے پاس قرآن ہو......اور بدقسمت ہے وہ قوم جس کے پاس قرآن ہو لیکن اس پر عمل کی بجائے اس نے اسے جزدانوں میں لپیٹ کر طاقوں میں سجا رکھا ہو۔ 'علماء' اسے رٹو طوطے کی طرح بے سمجھے بوجھے پڑھاتے ہوں اور حکمران اسے 'قلوں کے ختم' اور تعویزوں کے لیے مجرب سمجھتے ہوں لیکن ملک وقوم کی ترقی وکامیابی کا نسخہ مغربی فکر وتہذیب کی پیروی میں سمجھتے ہوں۔

اس قوم کی بقاء خطرے میں کیوں نہ ہو جو اپنے نظریۂ حیات سے کٹنے پر مصر ہو اور اس سے جڑنے پر تیار نہ ہو۔ جو غیروں کی غلامی پر راضی ہو لیکن رب کی غلامی اس پر دوبھر ہو۔ جس کی مذہبی قیادت اپنے اپنے فرقے اور مسلک پر مبنی اپنی جماعت کی کامیابی کے لیے غلبۂ دین کے تصور کو شکست دینے میں حجاب محسوس نہ کرے اور جس کی سیاسی قیادت اپنے اقتدار کے لیے ملک کی سرحدوں اور دینی قدروں کے مٹائے جانے میں باک محسوس نہ کرے۔ ایسی قوم یقیناً دعا کی مستحق ہے اور ہم اس کے لیے دعا گو ہیں۔ ''اے اللہ! ہمیں توبہ کی توفیق عطا فرما اور ہمیں سود و زیاں کے ادراک سے محروم نہ رکھ۔ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں سے نہ کر جن کے خلاف قیامت کے روز قرآن گواہی دے گا کہ اے مالک! یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں مجھے چھوڑے رکھا''۔

تزکیۂ نفس

خوشی کی تلاش

سکون واطمینان اور خوشی کی کس کو تلاش نہیں؟ آپ کو بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اسے کہاں تلاش کرتے ہیں؟ کثرتِ مال اور کثرت اولاد میں، سہولتوں اور آسائشوں کی کثرت میں، اچھے کھانوں اور جنسی لذت کے حصول میں۔ حالانکہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ان چیزوں کی کثرت کی خواہش و کوشش اور ان کا عملاً حاصل ہو جانا سکون واطمینان دیتا نہیں چھین لیتا ہے اور خوشی کی بجائے غم کا سبب بنتا ہے۔ مال ودولت کی حرص وہوس انسان کو کولہو کا بیل بنا دیتی ہے اور اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہنے دیتی۔ بیوی بچوں کی بڑھی ہوئی محبت وکثرت اور ان کی جائز وناجائز خواہشوں کی تکمیل ایک جھنجھٹ اور عذاب سے کم نہیں۔ ترک مشقت انسان کو سست وکاہل بنا دیتی ہے اور وہ موٹاپے اور دیگر عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اچھا کھانا اور زیادہ کھانا آپ کو توانا نہیں بناتا بلکہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس لے جاتا ہے۔ جنسی لذت کی کثرت آپ کو بیمار اور پژمردہ بناتی بلکہ ہڈیوں کا پنجر بنا کے چھوڑتی ہے۔ غرض ہمارا شب وروز کا تجربہ ہے کہ اگر ہم اپنی عقل استعمال کریں، اپنے نفس کی مانیں تو جن چیزوں کو ہم باعث خوشی واطمینان سمجھتے ہیں وہ درحقیقت غارت گر سکون واطمینان ہیں۔ تو اطمینان وخوشی کہاں سے ملے گی؟

عقل وتجربے کا صحیح استعمال یہ بتاتا ہے کہ سکون واطمینان وخوشی ملتی ہے اللہ کی ماننے میں، اس کی عبادت واطاعت میں اور اس کی ہدایت یہ کہتی ہے کہ تم جن چیزوں کی کثرت میں خوشی واطمینان تلاش کرتے ہو خوشی دراصل ان کی قلت میں ہے۔ رزق حلال اور رزق کفاف پر قناعت سیکھ لو تو چین سے رہو گے۔ بیوی بچوں کی محبت کو اللہ کی محبت کے تابع رکھو اور ان کی ناجائز خواہشات نہ مانو تو پرسکون اور خوشحال زندگی گزارو گے۔ محنت ومشقت کو عادت بنا لو راحت میں رہو گے۔ کھانے کے لیے زندہ نہ رہو بلکہ زندہ رہنے کے لیے جو تھوڑا بہت مل جائے کھا لو تو خوش ومطمئن رہو گے بلکہ خود بھوکے رہ کے کسی بھوکے کو کھلا دو تو بہت ہی زیادہ خوشی ملے گی۔ حلال جنسی لذت بھی اتنی کافی ہے کہ نفس کا شیطان غالب نہ آنے پائے۔

غرض لوگ جن چیزوں کی کثرت میں سکون، اطمینان اور خوشی ڈھونڈتے ہیں، خوشی دراصل ان کی قلت میں ہے (اسے شریعت کی اصطلاح میں زہد کہتے ہیں) لیکن ناس ہو مغربی فکر وتہذیب کا جس نے دنیا کو دین پر اور جسم کو روح پر غالب کر دیا ہے اور ہمیں قلت پر مطمئن رہنے کی بجائے کثرت کا غلام بنا کر حیوان بنا دیا ہے اور آخرت کی منزل ہماری نظروں سے اوجھل کر دی ہے اور ناس ہو ہماری عقل وفہم کا کہ ہم دین ودنیا سب بھلا کر اندھوں کی طرح اس تہذیب کی پیروی کیے جا رہے ہیں۔

تزکیۂ نفس

اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما دے

اے اللہ! میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ دوسروں کی فکر رہی ، افراد کی اصلاح کی ، معاشرے کی بہتری کی ، صحیح اسلامی ریاست کے قیام کی......لیکن میں نے اپنی اصلاح کے بارے میں کم ہی سوچا۔ اپنی آخرت کے بارے میں کم ہی غور کیا کہ جس دن اللہ کے حضور حاضر ہوں گا اس دن میرا کیا بنے گا!

اے اللہ! تو جانتا ہے میں نے ٹوٹا پھوٹا تیرے رستے پر چلنے کی کوشش کی لیکن تو یہ بھی جانتا ہے کہ میری نمازیں اکثر اٹھک بیٹھک ہی رہیں۔ میرے روزے بھوک پیاس برداشت کرنے تک ہی محدود رہے۔ مجھے آہ سحر گاہی کم ہی نصیب ہوئی، تنہائی کی عبادت کی لذتوں سے میں اکثر محروم ہی رہا۔

اے اللہ! اپنی محبت عطا فرما، اپنی خشیت عطا فرما، اپنی اطاعت نصیب فرما۔ مضبوط ایمان اور عمل صالح کی توفیق عطا فرما۔

اے اللہ! میرے گناہ کثیر ہیں اور نیکیاں بہت کم ہیں۔ اے اللہ! اگر تو نے مجھے معاف نہ فرمایا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میرے حال پر رحم فرما اور مجھے بخش دے۔

اے اللہ! قبر کے عذاب سے بچا، حشر کی تکلیفوں سے بچا اور جہنم کے رسوا کن عذاب سے بچا۔ اے اللہ! مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ مَیں گناہ گار ہوں، سیہ کار ہوں، خطا کار ہوں۔

اے اللہ! میرے اعمال ایسے نہیں کہ مجھے بخشوا سکیں لیکن تو نے خود فرمایا ہے کہ تیری رحمت تیرے غضب پر حاوی ہے۔ اے اللہ! تجھے تیری صفت رحمت کا واسطہ! میرے گناہ فرما اور مجھے جہنم کے عذاب سے بچا۔

اے اللہ! جنت الفردوس عطا فرما۔ اپنے حبیبؐ کی شفاعت نصیب فرما، ان کا ساتھ نصیب فرما اور اپنا دیدار نصیب فرما۔ **آمین یا رب العالمین .**

منہج غلبۂ دین

ڈاکٹر محمد امین

تعمیرِ فرد اور سماجی تبدیلی - کرنے کے اہم ترین کام (آخری قسط)

ہم اس موضوع اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مختلف عناوین سے پچھلے پانچ سال سے لکھ رہے ہیں۔ یہ ان سب پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہوئی ایک جامع تحریر ہے جس میں ہم نے ’تعمیر فرد‘ اور ’سماجی تبدیلی‘ کی اہمیت، جواز اور لائحہ عمل پر ذرا کھل کر گفتگو کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں بلکہ **ہماری درخواست ہے کہ البرہان کا ہر قاری ہمیں اس پر اپنا ردعمل دے بذریعہ** خط، ای میل، SMS، فون وغیرہ، خواہ وہ ہماری رائے کے حق میں ہو یا اس کے خلاف۔ جو اصحاب دانش ہماری رائے سے اختلاف رکھتے ہوں وہ اس کے خلاف لکھیں یا ہماری رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے متبادل تجاویز دیں تو ہم انہیں بخوشی البرہان میں شائع کریں گے۔ مدیر

۴- مسلک پرستی اور فرقہ واریت

اسلام ایک دین ہے یعنی ایسی الٰہی ہدایت جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں کے بارے میں مکمل رہنمائی عطا کرتی ہے۔ اس کا بنیادی ماخذ قرآن وسنت ہیں تاہم یہ دین چونکہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک باقی رکھنا تھا اور انبیاء بھیجنے کا سلسلہ اس نے بند کر دیا تھا لہٰذا اس نے امت مسلمہ کے اہل علم کو اجتہاد کی اجازت دی جس کی وجہ سے مختلف مذاہب یا مکاتبِ فکر وجود میں آ گئے جیسے فقہ میں مذاہب اربعہ وظاہریہ۔ عقیدہ میں اہل سنت واہل تشیع اور خوارج ومعتزلہ...... اور اہل سنت کے اندر اشاعرہ وماتریدیہ وغیرہ اور تصوف میں سلسلہ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ وسہروردیہ وغیرہ اور ہمارے عہد میں غلبۂ دین ونفاذ شریعت کے مختلف مناہج جیسے دعوتی واصلاحی جماعتیں، دینی سیاسی جماعتیں اور جہادی گروپ وغیرہ۔ یہ اختلافِ فکر ونظر فطری ہے اور انسانی معاشرے کی قوت تفکیر کا ایک ناگزیر مظہر لیکن یہ اسی وقت تک قابل قبول رہتا ہے جب تک یہ دین کے دائرے کے اندر رہے اور سبب تحزب وتعصب نہ بن جائے۔ اگر کوئی شخص فقہ، عقیدے اور تزکیے میں اپنے مذہب یا مکتب فکر کو دین کی جگہ دے دے، حق کو اس میں محصور سمجھے اور اپنے مسلک ومذہب کے علاوہ دیگر مذاہب اور مسالک کو گمراہ قرار دے اور انہیں مٹانے کی کوشش کرے تو ظاہر ہے یہ غلط ہے اور یہی مسلک پرستی اور فرقہ واریت ہے جو قابل اعتراض اور

قابل مذمت ہے ورنہ محض علمی وفکری اختلاف میں تو کوئی برائی نہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی یہی ہے کہ ہمارے دینی عناصر نے اپنے اپنے مذہب اور مکتبِ فکر کو دین کی طرح مقدس اور معصوم سمجھ رکھا ہے اور جو لوگ اس سے باہر ہیں ان سے گمراہوں اور غیر مسلموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے حالانکہ اجتہادی اور فروعی اختلاف قابل قبول ہونا چاہیے اور اسے دین والی جگہ نہیں دینی چاہیے۔

ہمارے دینی گروہوں/جماعتوں کے مناہج کا تجزیہ

ہمارے ہاں جو لوگ دینی کام کر رہے ہیں انہیں ہم سہولت بیان کی خاطر چار بڑے گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ۱- دینی سیاسی جماعتیں ۲-دعوتی و تبلیغی جماعتیں ۳-دینی مدارس و مساجد ۴-جہادی گروپ۔ اب ہم ان گروہوں کے مناہج کا مذکورہ بالا تین نکات (۱-کہ وہ فرد کی متوازن تعمیر شخصیت اور تشکیل کردار پر فوکس نہیں کر رہے۔ ۲-یہ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے فتنہ اور چیلنج کا کما حقہ ادراک نہیں رکھتے اور نہ اس سے نمٹنے کے لیے کوشاں ہیں اور ۳-ان میں باہم ربط و تعاون نہیں بلکہ بُعد و انتشار اور مخالفت کا ماحول ہے) کی روشنی میں تجزیہ کریں گے۔

تاہم ایک بات ہم شروع ہی میں نہایت واضح الفاظ میں اور زور دے کر کہہ دیں کہ اس تجزیے سے مقصود ان گروہوں اور جماعتوں پر منفی تنقید اور ان سے دشمنی اور ان کی ہوا خیزی نہیں ہے بلکہ ہم ان دینی گروہوں کی مثبت خدمات کے معترف ہیں، ان کے قدر دان ہیں اور ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ تاہم ان گروہوں کے قائدین اور ان کے پیروکاروں کی خدمت میں ہم بصد ادب عرض کرتے ہیں کہ ان کا موقف و منہج اپنی تفصیل میں نصوص قرآن وسنت کے ساتھ کسی نہ کسی اجتہادی رائے پر مبنی ہے اور اصول فقہ کا یہ متفقہ قاعدہ ہے کہ اجتہادی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی (البتہ قول رسول ﷺ کے مطابق غلطی کرنے کی صورت میں بھی مجتہد مستحق ثواب ہے...... نہ کہ مستحق مذمت) اور دوسرے یہ کہ محدثات میں اجتہادی حکم حالات کے بدلنے سے بدل جاتا ہے کیوں کہ اصولِ فقہ کا قاعدہ ہے کہ **'الحکم یدور مع العلہ'** جیسا کہ امام شافعیؒ جب فلسطین سے مصر منتقل ہوئے تو انہوں نے بہت سے معاملات میں اپنی اجتہادی رائے بدل لی اور بہت سے متاخرین فقہاء نے متقدمین کی آراء سے اسی بنیاد پر اختلاف کیا۔ لہٰذا دینی جماعتوں کے قائدین اور پیروؤں کی خدمت میں ہم عرض کرتے ہیں کہ جب ہم انہیں ان کے دینی کام کے منہج کو تبدیل کرنے کے لیے کچھ مشورے دیتے ہیں تو ہم کسی نص کی مخالفت نہیں کر رہے ہوتے اور نہ کسی اجتہادی رائے کی مذمت ہمارے پیش نظر ہوتی ہے بلکہ ہماری تجاویز سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کا

کام مزید موثر ہو جائے تا کہ ان کی محنتیں زیادہ بار آور ہوں، زیادہ کامیاب ہوں اور انہیں مزید بہتر نتائج ملیں اور دینی مقاصد کے حصول کے لحاظ سے ان کا منہج مزید موثر اور ثمر آور ہو جائے لہٰذا ہمارے اختلاف رائے اور ہماری تجاویز کو رد کرنے میں وہ جلدی نہ کریں اور نہ ہمیں تنقید و دشمنی سے متہم کریں بلکہ انہیں چاہیے کہ ہماری گزارشات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور فرمائیں اور یہ ذہن میں رکھیں کہ ہم ان کے خیر خواہ ہیں، ان کی بھلائی کے خواہاں ہیں اور انہیں کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں لہٰذا ان کے کام کو مزید بہتر بنانے کے لیے اگر ہم کچھ تجاویز دیں تو انہیں چاہیے کہ ان کا خیر مقدم کریں اور ان پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں۔ اگر ان میں کچھ اچھی اور مفید چیز پائیں تو اسے قبول کر لیں ورنہ اس سے صَرفِ نظر کریں کہ حدیث رسول مقبول ﷺ کی رو سے حکمت و دانائی کی ہر بات مومن کی گم شدہ میراث ہے لہٰذا اسے چاہیے کہ جہاں سے بھی ملے لے لے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم مذکورہ نکات کے حوالے سے ترتیب وار اپنا تجزیہ ان کے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی تجاویز ان کے غور و فکر کے لیے ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

دینی سیاسی جماعتیں

فرد کی تعمیر شخصیت و کردار سازی: کیا دینی سیاسی جماعتوں کو صرف سیاسی جدوجہد کرنی چاہیے یا انہیں دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ افراد کی تعمیر شخصیت اور تشکیل کردار کو بھی بھرپور اہمیت دینی چاہیے؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ افراد کی تعمیر شخصیت اور کردار سازی کا کام بہت اہم ہے اور اس سے غفلت کا نتیجہ یہ نکلا ہے اور آئندہ بھی نکلے گا کہ دینی جماعتیں عوام کی حمایت سے محروم ہوتی چلی جائیں گی اور ان کا ووٹ بنک سکڑتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اصل سوال یہ نہیں کہ افراد کی تعلیم و تربیت کا کام کرنا چاہیے یا نہیں بلکہ غور کے قابل بات یہ ہے کہ یہ کام کس طرح اس انداز سے کیا جائے کہ اس کے مفید و مثبت اثرات ان دینی جماعتوں کی سیاسی جدوجہد پر پڑیں۔

اس ضمن میں سب سے کامیاب تجربہ تحریک دیوبند کا ہے جس نے تقسیم کار کے اصول پر عمل کر کے اپنے کام کو تین جماعتوں/اداروں میں بانٹ دیا ہے۔ دین کی عمومی دعوت کے لیے 'تبلیغی جماعت' ہے۔ دینی تعلیم کے لیے دینی مدارس قائم کیے گئے ہیں اور سیاسی جدوجہد کے لیے جمعیت علماء اسلام قائم کی گئی ہے اور سب سے ناکام تجربہ جماعت اسلامی کا ہے جس نے خود کو ایک اصولی جماعت قرار دے کر دین کے مختلف کام ایک ہی نظم کے تحت کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ انتخابی سیاست میں بھی ناکام ہو گئی اور اس کا ووٹ بنک سکڑتا چلا گیا اور دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کے کام کو اس نے کما حقہ اہمیت

دی ہی نہیں یا دوسرے الفاظ میں سیاسی جدوجہد پر ترکیز اور اسے ترجیح اول قرار دینے کی وجہ سے وہ افراد کی تعمیر شخصیت و کردار کے لیے زیادہ وقت اور صلاحیتیں وقف نہیں کر سکی۔ جماعت کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو اپنی آخری عمر میں (۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شکست کے موقع پر) اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور انہوں نے جماعت کی شوریٰ میں یہ بات رکھی بھی لیکن خود ان کی تیار کردہ قیادت نے ان کی بات کو وزن دینے سے انکار کر دیا اور جماعت تب سے زوال پذیر ہے لیکن بات اس کی قیادت کی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اس مسئلے کا حل تقسیم کار میں ہے تاکہ سیاسی جدوجہد کے ساتھ تعلیم و تربیت اور دعوت و اصلاح کے ذریعے تعمیر شخصیت و کردار کے لیے زوردار کام کیا جا سکے۔ یہی حال دوسری دینی سیاسی جماعتوں کا ہے کہ تعمیر فرد نہ ان کی ترجیح اول ہے اور نہ ان کے پاس اس کام کے لیے وقت اور صلاحیتیں ہیں۔

تعمیر فرد پر کام نہ کرنے کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں نے اپنی محنت اور عوامی دباؤ سے جو اسلامی قوانین بنوائے تھے وہ اگرچہ آئین اور قانون کی کتب میں درج ہیں لیکن حکومتیں اور ریاستی ادارے (جیسے فوج، عدلیہ، پولیس، بیوروکریسی وغیرہ) ان پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حالت یہ ہے کہ حدود قوانین ۱۹۷۹ء سے ملک میں نافذ ہیں لیکن آج تک کسی ایک چور کا ہاتھ نہیں کاٹا گیا اور نہ کسی ایک زانی کو سنگسار کیا گیا ہے حالانکہ ملک میں امن و امان کی حالت مخدوش ہے، چوریاں اور ڈاکے عام ہیں، فحاشی اور زنا کی کثرت ہے۔ اسلام کے سخت قوانین کتب قانون میں موجود ہیں لیکن حکومت اور اس کا کوئی ادارہ ان پر عمل کے لیے تیار نہیں۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اقامت دین کا جو حکم دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمان پہلے اپنی ذات پر اسلام نافذ کریں، پھر اپنے گھر، خاندان، گلی محلے اور برادری و قبیلے کی فکر کریں اور پھر اس کے بعد سارے معاشرے اور ملک کی باری آئے گی۔ کسی معاشرے میں تبدیلی لانے کا یہی فطری اور منطقی منہاج ہے کہ تبدیلی کا عمل نیچے سے اوپر کو چلے اور اگر کوئی سوچتا ہے کہ یہ منہاج اوپر سے نیچے کو چلے، اور اقتدار ملے تو ریاست کو صالح بنایا جائے اور پھر اقتدار کی قوت سے معاشرے اور فرد کی اصلاح کی جائے تو وہ جنت الحمقا میں بستا ہے، ایک غیر عقلی اور غیر منطقی بات کہتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ جو انقلاب لائے تھے، اس سمیت آج تک دنیا میں کوئی بڑی تبدیلی اور پائیدار انقلاب اس طرح نہیں آیا کہ اس نے اوپر سے نیچے کو سفر کیا ہو بلکہ ہمیشہ تبدیلی پہلے فرد میں آتی ہے اور پھر وہ معاشرے اور ریاست پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ii- **مغربی تہذیب:** پاکستان میں دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی بلکہ پاکستانی معاشرے کی

دین سے دوری اور مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت اور پاکستانی معاشرے وریاست میں مغربیت کے نفوذ کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان جماعتوں نے مغرب کی لادین جمہوریت میں اسلامی اصولوں کی پیوندکاری سے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا ہے اور اس کے ذریعے ملک میں شریعت نافذ کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ ان علماء کرام کی سادہ لوحی ہے یا اسے ان کی اجتہادی غلطی سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ مغربی جمہوریت ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹزم جیسے لادینیت پر مبنی نظریات اور اپنے ملحدانہ ورلڈ ویو کی وجہ سے اپنی کنہ اور نہاد میں اسلام مخالف ہے اور اسلام کے انمل بے جوڑ پیچ ورک سے اسے نہ تو اسلامی قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے اور نہ اس سے نفاذ شریعت اور معاشرے وریاست کی اسلامائزیشن کا کام لیا جاسکتا ہے لہٰذا ہم کھلی آنکھوں یہ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ اس برائے نام 'اسلامی جمہوریت' کی وجہ سے پاکستانی معاشرے میں مغربی اقدار غالب آ گئی ہیں اور اسلامی اقدار غائب ہوگئی ہیں۔ دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہوگئی ہیں اور سیاسی جماعتیں سیکولر ہوگئی ہیں۔ لہٰذا دینی سیاسی جماعتوں کی ٦٦ سالہ جدوجہد کی ناکامی کے پیش نظر پاکستان کے علماء کرام، مفتیان عظام اور فقہائے کرام کو مل بیٹھنا چاہیے اور اپنے سابقہ فیصلے اور فتوے پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ مغرب کی لادین جمہوریت کو اسلامی نہیں بنایا جاسکتا اور نہ اس کے ذریعے شریعت نافذ کی جاسکتی ہے لہٰذا انہیں چاہیے کہ مغربی جمہوریت اور مغربی فکر و تہذیب کو رد کرنے کا اعلان کریں۔ دعوت واصلاح، تعلیم وتربیت اور میڈیا کے ذریعے افراد کی اسلامی ذہن سازی اور ان کے تزکیۂ نفس پر کام کریں اور اسلام کے سیاسی نظام کا قابل عمل خاکہ تیار کر کے عوام کی حمایت سے اسے نافذ کرائیں۔ عبوری دور کے لیے معاشرے وریاست کو مزید بگاڑ سے بچانے کے لیے اگر علماء کرام ناگزیر سمجھیں تو موجودہ سیاسی ڈھانچے کو مجبوراً عارضی طور پر اور محدود مدت کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

iii- دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ وہ متحد نہیں ہوتیں بلکہ باہم مسابقت میں اپنی صلاحیتیں ضائع کرتی ہیں اور ایک دوسرے کی مخالفت کر کے علماء اور دین کی ہوا خیزی کا سبب بنتی ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت کو فروغ دیتی ہیں۔ ان کے متحد نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر دینی سیاسی جماعت (ماسوا جماعت اسلامی کے) کسی نہ کسی مسلک پر مبنی ہے۔ اب ظاہر ہے ہر وہ شخص جو اپنے بھیجے میں ذرا سی بھی عقل رکھتا ہے، یہ سمجھ سکتا ہے کہ مسلک پر مبنی جماعت کبھی بھی انتخابات نہیں جیت سکتی کیونکہ اسے ووٹ صرف اس کے مسلک کے لوگ ہی دیں گے۔ گویا مسلک پر مبنی جماعت بنانا اپنی ناکامی کے اسٹیمپ پیپر پر مہر ثبت کرنے کے مترادف ہے لیکن اس کے باوجود علماء کرام کی ساری جماعتیں اپنے اپنے مسلک پر مبنی ہیں بلکہ ہر مسلک کے اندر بھی کئی

کئی دھڑے ہیں اور یہ کہنا مبالغہ پر مبنی نہ ہوگا کہ ہر مسلک کے اندر جتنے لیڈر ہیں وہاں اتنی ہی جماعتیں اور دھڑے ہیں۔ مسلک اور فرقے کی بنیاد پر جماعت سازی خلاف آئین بھی ہے لیکن اسٹیبلشمنٹ، حکومتیں اور عدالتیں انہیں 'غیر آئینی' قرار نہیں دیتیں تاکہ مسلک پر مبنی جماعتیں آپس میں متحد نہ ہوں بلکہ باہم لڑتی رہیں اور کمزور رہیں، کامیاب نہ ہوسکیں اور سیکولر جماعتیں کامیاب ہو کر آرام سے حکومت چلا سکیں۔

سوال یہ ہے کہ علماء کرام نے یہ جماعتیں کیوں قائم کی ہیں؟ اگر ان کا جواب یہ ہو کہ نفاذ شریعت/ غلبۂ دین/نظام مصطفیٰ/اسلامی انقلاب/اقامت دین...... کے لیے تو پھر ان سے پوچھا جانا چاہیے کہ آپ اس نفاذ شریعت پر متحد کیوں نہیں ہوتے؟ یہی وجہ ہے کہ مخالفین کو یہ طعنہ دینے کا موقع ملتا ہے کہ ان علماء کرام نے یہ جماعتیں فرقہ واریت اور اپنی لیڈری چمکانے کے لیے بنا رکھی ہیں اور یہ خلوص و فراست سے عاری ہیں ورنہ اگر یہ فرقہ واریت سے بالاتر ہو جائیں اور متحد ہو جائیں تو یہ آج بھی کامیاب ہو سکتی ہیں۔

دعوتی و تبلیغی جماعتیں

فرد کی تعمیر شخصیت و کردار سازی: ۱- دعوتی و تبلیغی جماعتوں کا یہ پہلو بلاشبہ قابل تحسین ہے کہ وہ فرد کی تعلیم و تربیت پر فوکس کرتی ہیں۔ ہماری دعوتی و تبلیغی جماعتوں میں سب سے بڑی جماعت دیوبند مکتب فکر کی 'تبلیغی جماعت' ہے جو غالباً عالم اسلام کی سب سے بڑی دینی تحریک ہے اور حج کے بعد سب سے بڑے اجتماعات منعقد کرتی ہے۔ اس کا یہ طریق کار بھی نہایت کامیاب ثابت ہوا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے گھروں اور کام کاج سے چھڑوا کر اس کام کے لیے مختص کرتی ہے اور انہیں دعوت کے لیے ہمیشہ سرگرم سفر اور متحرک رکھتی ہے اور بلاشبہ موثر بھی ہے اور اپنے شرکاء میں تبدیلی بھی لے آتی ہے...... تاہم ان خوبیوں کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس جماعت کا تصور دین بہت محدود ہے۔ یہ لوگوں کو دین دار بنانے کے ابتدائی کام کرتی ہے مثلاً ان کا کلمہ سیدھا کرا دیا، انہیں نماز پہ لگا دیا یا انہوں نے داڑھی رکھ لی...... وغیرہ لیکن دین کا وسیع تر تصور اس کے ہاں موجود ہی نہیں کہ یہ دین سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، قانونی...... نظام بھی رکھتا ہے اور معاشرے اور ریاست کو مسلمان کرنا بھی ضروری ہے لہٰذا یہ جماعت اسلام کی اجتماعی زندگی اور معاشرے و ریاست کی اصلاح میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی اور اس کے کارکنوں کے بارے میں اکثر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو تبلیغ میں اس طرح فنا کر دیتے ہیں کہ حقوق العباد اور اسلامی اجتماعی زندگی کے تقاضے مجروح ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

پھر یہ جماعت اپنی ٹھیٹھ طرز کی دعوتی حکمت عملی پر تو سختی سے کاربند ہے لیکن جدید تعلیم اور دینی تعلیم سے زیادہ اعتنا نہیں کرتی اور نہ میڈیا کے زوردار ذریعے کو تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں دلچسپی

لیتی ہے حالانکہ یہ تینوں ادارے آج کل لوگوں کے فکر و عمل پر شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے افراد کی ذہن سازی اور کردار سازی پر اسلامی حوالے سے اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔ تصور دین محدود ہونے کی وجہ سے اس کا تصور تزکیہ بھی محدود ہے اور یہ محض چند ظواہر تک محدود رہتا ہے۔

ii- **مغربی تہذیب:** دعوتی و تبلیغی تحریکوں خصوصاً تبلیغی جماعت کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ مغربی فکر و تہذیب سے اعتنا نہیں کرتی۔ نہ تو اس سے متاثر ہوتی ہے اور نہ اسے ردّ کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامیوں کا کہنا ہے کہ اس کا یہ رویہ مستحسن ہے کیونکہ اس طرح وہ مغربی تہذیب کے اثرات قبول نہیں کرتی اور خود مغربی ممالک میں بھی غیر سیاسی ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرناک نہیں سمجھی جاتی بلکہ برداشت کی جاتی ہے اور اس طرح اسے اسلام کے حق میں کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے جب کہ اس جماعت پر تنقید کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ اسلام کو اس طرح ادھورے انداز میں پیش کرنا اور اس کی اجتماعی زندگی کو نظر انداز کرنا اور اسے قوت و شوکت سے محروم رکھنا خود مغرب کے مفاد میں ہے لہٰذا خود استعمار نے قیام پاکستان سے قبل (سرسید اور قادیانی کی طرح) اس جماعت کے قیام اور اس کی کامیابی میں بھی کردار ادا کیا تا کہ یہ جماعت اسلام کی سیاسی اور اجتماعی قوت و شوکت کے لیے کام نہ کرے اور ایسا اسلام پیش کرے جو مذہب گوسفنداں ہو۔ چنانچہ یہ جماعت آج بھی پاکستانی معاشرے اور ریاست کے غیر اسلامی رجحانات پر کوئی تنقید نہیں کرتی اور نہ ان کی مذمت و مخالفت کرتی ہے۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حکومت فوجی ہے یا سیاسی، اسلامی رجحانات رکھتی ہے یا غیر اسلامی، انہیں بس اپنی تبلیغ سے غرض ہے جو ہر حالت میں جاری رہتی ہے۔ اسی طرح یہ جماعت ملحدانہ مغربی تہذیب کے مسلم معاشرے میں دخیل اور موثر ہونے اور اسلامی اقدار کی جگہ لینے کے باوجود اس کی مذمت اور مزاحمت نہیں کرتی اور نہ اسے ردّ کرنے کے لیے کوئی اقدامات کرتی ہے۔

iii- باہمی تعاون: بلاشبہ تبلیغی جماعت درویشانہ اور صوفیانہ مزاج رکھتی ہے۔ اس کا مزاج صلح کل ہے اور وہ دوسرے مسالک سے الجھنا پسند نہیں کرتی لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مزاج فرقہ وارانہ نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسے صرف دیوبندی مساجد میں جگہ ملتی ہے اور دوسرے مکاتب فکر کی مساجد ان کی میزبانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی دیوبندی مسلک کی جماعت ہے۔ اس کی تعلیم میں ایک دیوبندی عالم (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ) کی کتاب فضائل اعمال سبقاً سبقاً پڑھی جاتی ہے۔ اس کے تعلیمی و تربیتی نصاب میں دوسرے مسالک کے علماء کرام کی کتب زیر مطالعہ آنا تو دور کی بات ہے خود خدا کی کتاب (قرآن حکیم) کو کوئی پذیرائی نہیں ملتی۔ اسی طرح تبلیغی جماعت نہ دوسری دینی دعوتی جماعتوں کی حلیف بنتی ہے اور نہ دینی سیاسی جماعتوں کا ساتھ

دیتی ہے اور نہ دوسری دینی جماعتیں اس کے قریب آتی ہیں۔

دینی مدارس

برصغیر کے دینی مدارس کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے انہیں بجاطور پر اسلام کے قلعے قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جتنا بھی دین پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر انہی دینی مدارس کا مرہون منت ہے جن کے علماء نے بھوکے پیاسے رہ کر اور مٹی کے حجروں میں بیٹھ کر اس وقت دین کی شمع جلائی جب استعمار نے مسلمانوں کا نظام تعلیم برباد کر کے اپنی فکر وتہذیب کے مطابق انگریزی سکول کھول دیے تھے اور ہندوستان سے اسلام کے مٹنے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا...... تاہم الکمال للہ تعالیٰ۔ اور ہم مذکورہ تین حوالوں سے مدارس کی بعض کمزوریوں کی نشان دہی کریں گے جس سے مقصود یہ ہے کہ مدارس ان پہلوؤں پر توجہ دیں تاکہ وہ معاشرے میں زیادہ موثر اور تعمیری کردار ادا کرسکیں۔ گویا ہمارے تجزیے کا مقصد دینی مدارس پر نقد کرنا، ان کی عیب جوئی کرنا اور ان کی ہوا خیزی نہیں ہے بلکہ ہم ان کی خدمات کے قدردان، معترف اور مداح ہیں اور ہماری تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ یہ مدارس پہلے سے بھی بہتر اور مفید کردار ادا کریں۔

i- **فرد کی تعمیر شخصیت وکردار سازی:** اس میں کوئی شک نہیں کہ جو طلبہ دینی مدارس کے پاس پہنچتے ہیں یہ مدارس ان کو تعلیم بھی دیتے ہیں اور ان کی تربیت بھی کرتے ہیں کیونکہ اکثر مدارس اقامتی ہیں اور درس نظامی ہمارے ہاں آٹھ سال کا ہے اس طرح ان مدارس کو اپنے طلبہ کے فکر وعمل پر اثر انداز ہونے کا کافی موقعہ مل جاتا ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ اکثر محنتی، مودب اور بااخلاق ہوتے ہیں اور یہاں ہڑتالوں اور احتجاج کا اس طرح رواج نہیں ہے جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ہے۔ تاہم بعض چیزیں محتاج نظر ثانی ہیں مثلاً

i- ان مدارس کا مقصد تعلیم آج بھی وہی ہے جو انیسویں صدی کے وسط میں تھا یعنی مساجد اور مدارس کے لیے افراد کار مہیا کرنا حالانکہ قیام پاکستان کے بعد یہ مقصد تعلیم بدل جانا چاہیے تھا اور معاشرے وریاست کے لیے کارکن پیدا کرنا بھی ان کے مقاصد تعلیم میں شامل ہوجانا چاہیے تھا۔

ii- ان کا نصاب تعلیم طلبہ کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ عصری مسائل میں معاشرے کی رہنمائی کرسکیں مثلاً فقہ کا نصاب قدوری اور ہدایہ وغیرہ پر مشتمل ہے لیکن یہ فقہی مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہیں کراتا۔ طلبہ کو قرآن وسنت سے استنباط کا طریقہ اور حالات وحوادث پر ان کا اطلاق نہیں سکھاتا۔ طلبہ کو جدید

قانون (پاکستانی قوانین اور اقوام متحدہ کے قوانین جیسے کہ بنیادی حقوق کا چارٹر وغیرہ) سے واقف نہیں کراتا اور طلبہ قانون سازی کے مراحل اور طریق کار اور جدید اصول قانون سے نابلد ہوتے ہیں۔

iii- یہ نصاب مدارس کے طلبہ کو جدید عصری علوم سے گہری واقفیت تو کجا ان کا تعارفی مطالعہ بھی نہیں کراتا چنانچہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء جدید علوم سے ناواقف ہوتے ہیں اور وہ جدید علوم سے مستفید ہونے والے معاشرے کے لاکھوں کروڑوں لوگوں کے سوالوں کے جواب دینے اور ان کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

iv- علماء کرام ان طلبہ کی تو بلاشبہ تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے ہیں جو ان کے پاس مدارس میں پہنچتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ جو کروڑوں طلبہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں، کیا وہ مسلمان اور پاکستانی نہیں؟ کیا علماء کرام پر ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نہیں؟ سوال یہ ہے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ کیا کر رہے ہیں؟

v- یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ ایک عام فرد مسلم کی تعمیر شخصیت و کردار پر دینی مدارس کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کا مدارس کتنا اور کس طرح اہتمام کرتے ہیں؟ اگر کوئی اس کا جواب یہ دے کہ عامۃ الناس کی تعلیم و تربیت کا کام علماء کرام مساجد کے ذریعے کرتے ہیں تو پھر اس امر پر غور کی بھی ضرورت ہے کہ مساجد کا موجودہ نظام و کردار عامۃ الناس کی اسلامی تعلیم و تربیت اور اسلامی ذہن سازی و کردار سازی پر کتنا اثر ڈالتا ہے؟ اور اسے کس طرح مزید موثر بنایا جا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج مساجد کا کردار وہ نہیں جو صدر اوّل میں تھا لہٰذا مساجد کے کردار میں وسعت لانا بھی ناگزیر ہے۔

ii- **مغربی تہذیب:** آج سے ڈیڑھ صدی پیشتر جب علماء کرام نے موجودہ طرز کے دینی مدارس کا آغاز کیا تھا تو انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے استعمار دشمنی کی فضا علماء کے حلقوں میں موجود تھی لہٰذا انہوں نے مغربی فکر و تہذیب کے علمی مطالعے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ رفتہ رفتہ وہ فضا برقرار نہ رہی اور قیام پاکستان کے بعد تو ماحول بالکل ہی تبدیل ہو گیا۔ اب اس بات کی ضرورت تھی کہ دینی مدارس اپنے ہاں مغربی فکر اور اس کے علوم کا تنقیدی مطالعہ کرتے اور اس کی درس و تدریس کا اہتمام کرتے تا کہ وہ خود مغربی فکر و تہذیب کی ابلیسیت کے جال سے بچ سکتے اور اور مسلم عوام (و خواص) کو اس سے بچا سکتے؛ اور علمی اور فکری سطح پر دنیا اور مسلم معاشروں کے سامنے مغربی فکر و تہذیب کے الحاد، ابلیسیت اور ناکامیوں کا پول کھول سکتے اور اس کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت، برتری اور اس کا قابل عمل ہونا دلائل و براہین سے ثابت کر سکتے تا کہ مغربی فکر و تہذیب کی ہوا خیزی اور اشاعت و غلبۂ اسلام کی راہ ہموار ہوتی۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دینی مدارس اس کام کی ضرورت اور اس کے احساس سے عاری ہیں اور مغربی فکر و تہذیب کا گہرا مطالعہ تو رہا ایک طرف، وہ تو اپنے ہاں انگریزی پڑھانے کو تیار نہیں اور نہ اپنے طلبہ کو حکومتی ڈگریوں کے لیے ایک آدھ معاصر مضمون پڑھانے کو خوشدلی سے تیار ہیں۔

iii- **باہمی تعاون**: یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں کے اکثر دینی مدارس کسی نہ کسی فقہی مسلک کی بنیاد پر قائم کیے جاتے اور چلائے جاتے ہیں۔ وہ 'دین' کے عالم نہیں اپنے اپنے مسلک کے عالم تیار کرتے ہیں۔ ان کے طرز تدریس، مشق کے لیے تقریروں کے عناوین اساتذہ کی تربیت، ماحول...... سب ایسا ہوتا ہے گویا کہ اپنے مسلک کے سپاہی اور علمبر دار تیار کیے جاتے ہیں جن کی جدوجہد کا ہدف دوسرے باطل مسالک کا قلع قمع کرنا ہوتا ہے۔

اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہ ہے (اگر چہ اس کے دوسرے اسباب بھی ہیں) کہ ہماری مسجدیں، دعوت و اصلاح کی تحریکیں، دینی سیاسی جماعتیں......سب مسلک کی بنیاد پر قائم ہیں (الا ماشاءاللہ) اور انہوں نے عوام کو بھی تقسیم کر رکھا ہے۔ بعض حالات میں یہ رجحانات عدم برداشت کی انتہاء کو پہنچ جاتے ہیں اور بات قتل و غارت تک جا پہنچتی ہے۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے معتدل مزاج علماء کرام اس مسلک پرستی اور فرقہ پرستی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور:

۱- دینی مدارس کو مسلک پرستی اور فرقہ واریت کے ماحول سے نکالا جائے۔ اس کے لیے متعدد اقدامات کیے جانے چاہئیں مثلاً

i- کسی مدرسے کی رجسٹریشن مسلک کی بنیاد پر نہ کرائی جائے/نہ کی جائے۔

ii- وفاقوں کی رجسٹریشن بھی مسلک کی بنیاد پر منسوخ کر دی جائے۔

iii- طرز تدریس ایسا ہو کہ حق کو اپنے مسلک میں محصور قرار دے کر دوسرے اجتہادی مسالک کی تغلیط و ابطال کی کوشش نہ کی جائے۔

iv- فقہی مذاہب کے درمیان تقابلی مطالعہ کو رواج دیا جائے۔

v- یہ پابندی ختم کر دی جائے کہ سارے طلبہ کا تعلق ایک ہی مسلک سے ہو۔

vi- مختلف مسالک کے اساتذہ کی تعیناتی کی جائے۔

vii- اہل سنت کے چار وفاقوں (دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی) کا نصاب کم

وبیش یکساں ہے اور معمولی محنت سے ان وفاقوں کو ایک وفاق اور ایک نصاب پر جمع کیا جا سکتا ہے زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ نصاب ایک ہو اور کتابیں مختلف مصنفین کی ہوں۔

viii- سارے مسلک کے مدارس میں طلبہ کا تبادلہ ممکن ہو جائے۔

ix- علماء کے درمیان اتحاد مسالک کی شرعی حیثیت اور ادب الخلاف کا مضمون شامل نصاب کیا جائے۔

۲- دینی مدارس میں بعد عصر و مغرب جدید تعلیمی اداروں کے طلبہ اور عوام الناس کے لیے کورسز رکھے جائیں۔

۳- دینی مدارس کے علماء کرام جدید تعلیم کے ادارے کھولیں اور انہیں اسلامی تناظر میں چلائیں۔

جہادی گروپ

i- **تعمیر فرد اور کردار سازی:** جہاد اسلام کا بہت عظیم فریضہ ہے اور جان کی بازی لگا دینے سے بڑھ کر شہادت حق کا کون سا قرینہ ہو سکتا ہے؟ جہاد کی دو بڑی قسمیں ہیں: اقدامی اور دفاعی- اقدامی جہاد اس وقت مسلمانوں پر فرض نہیں کیونکہ وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ دفاعی جہاد کی کنجی ان کے ہاتھ میں نہیں کیونکہ مسلمان خود کسی پر حملہ نہیں کرتے لیکن اگر کفار کسی مسلم ملک پر حملہ کر دیں تو ظاہر ہے اپنے آپ کو بچانے کے لیے مزاحمت کرنا ایک مجبوری ہے لہٰذا مسلمان دفاعی جہاد پر مجبور ہیں اور اس پر اعتراض کا کوئی محل نہیں کہ دنیا کا ہر قانون اپنی جان کی حفاظت کے لیے مدافعت کا حق دیتا ہے۔ کفار اگر اس مزاحمت کو دہشت گردی کہتے ہیں تو یہ ان کے جھوٹے پروپیگنڈے کا ایک حصہ ہے۔ امت کے علماء و فقہاء اس پر بھی متفق ہیں کہ یہ دفاعی جہاد کسی حکومت کو کرنا چاہیے البتہ اس بات میں کہ اگر مسلم حکومت ختم ہو جائے یا فاتح دشمن کی یرغمال، حلیف اور گماشتہ بن جائے تو عوامی گروہوں کو دفاع جہاد کا حق ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ اکثر کا خیال ہے کہ اس کی اجازت ہے جب کہ اقلیت خصوصاً مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب مسلم سکالرز کی رائے یہ ہے کہ یہ جائز نہیں۔

اسی طرح علماء کرام اس معاملے میں بھی مختلف فیہ ہیں کہ اگر غیر صالح مسلم حکومت شریعت نافذ نہ کرے تو کیا مسلم گروہوں کو اس کے خلاف خروج یا مسلح مزاحمت کی اجازت ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ خروج شرعی جہاد ہو گا یا نہیں؟ پاکستان کے علماء کرام کی بڑی اکثریت کا رجحان یہ ہے کہ خروج کی ضرورت نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں کہ اس مزاحمت کے پیچھے اسلام اور مسلم دشمن قوتوں (امریکہ و بھارت وغیرہ)

کی پشت پناہی کا اشتباہ بھی موجود ہو اور ان جہادی گروہوں نے فرد کی تبدیلی اور معاشرے کی اصلاح کے لیے کوئی خاص جدوجہد نہ کی ہو؛ لیکن اس کے باوجود علماء کی اکثریت کو ان مزاحمت کاروں سے ہمدردی ضرور ہے کیونکہ نفاذ شریعت کا ہدف ان کو بھی عزیز ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور حکومتیں بہر حال ملک میں نفاذ شریعت میں لیت ولعل سے کام لے رہی ہیں اور علما، دینی جماعتوں اور مسلم عوام کا نفاذِ شریعت کا مطالبہ کما حقہٗ نہیں مان رہیں۔

جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ جب پرامن انتقال اقتدار کے راستے کھلے ہیں اور ہمارے سامنے حکومتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور دعوت واصلاح، تعلیم وتربیت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کام پر بھی پابندی نہیں ہے اور دینی گروہ اگر ہمت وصبر سے جدوجہد کریں تو افراد کی زندگیوں میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور معاشرے کی اصلاح کر سکتے ہیں جس کے اچھے اثرات لازماً ریاست پر بھی پڑیں گے تو پھر خروج کی شرعاً کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ جو لوگ قوت سے شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں ان سے پوچھا جانا چاہیے کہ کیا انہوں نے پرامن دعوت وتبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے؟ تعلیم وتربیت اور میڈیا کے ذریعے لوگوں کی ذہن سازی کی ہے؟ ان کے تزکیۂ نفس کے ذریعے ان کی کردار سازی کے لیے جدوجہد کی ہے؟ جب انہوں نے یہ سب کچھ نہیں کیا اور اتنے لمبے عرصے تک اور اتنے بڑے پیمانے پر نہیں کیا کہ اسے اتمام حجت قرار دیا جا سکے تو وہ ڈنڈے کے زور سے شریعت کیوں نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ اور شرعاً اس کی کیا ضرورت اور گنجائش ہو سکتی ہے؟

خروج کے قائل اور اس پر عامل بعض جہادی گروہ اپنے عمل اور رویے کا یہ جواز یا عذر پیش کرتے ہیں کہ جہاد خود ایک تربیت گاہ ہے جو نفس کا تزکیہ کرتی ہے لہٰذا ہمیں دعوت واصلاح کی حاجت نہیں۔ ہماری رائے میں اس نظریے کا صحیح ہونا مشکوک ہے کیونکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جنگ (خواہ وہ شرعی جہاد ہی کیوں نہ ہو) بہر حال فتوت اور قوت شہویہ وغضبیہ کو ابھارتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابتداء میں صحابہ کو جنگوں میں نکاح متعہ (عارضی نکاح) کی اجازت دی اور جب یہ اجازت منسوخ کر دی گئی تو ایک مجاہد نے آپ ﷺ سے خصی ہونے کی اجازت طلب کی لیکن آپ نے اجازت نہ دی اور یہ ہمارا بلکہ ساری دنیا کا مشاہدہ ہے کہ جن شہروں میں چھاؤنیاں ہوتی ہیں وہاں قحبہ خانے ضرور ہوتے ہیں اور جنگوں میں سپاہی فریق مخالف کی عورتوں کی عصمت دری بکثرت کرتے ہیں۔

اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قتال کا ماحول انسان میں جارحیت کو ابھارتا ہے اور وہ نرمی، شفقت،

بردباری، تحمل اور ایڈجسٹمنٹ کی صلاحیت جو سول معاشرے میں عموماً افراد میں ہوتی ہے وہ جنگی ماحول اور تربیت میں مجروح ہوجاتی ہے چنانچہ افغانستان ہی کی مثال لیجیے کہ روسیوں کے انخلاء کے بعد متحدہ حکومت بنانے کی بجائے مجاہدین گروپوں نے آپس میں ہی قتال شروع کردیا اور اس سے بڑا جانی اور مالی نقصان ہوا...... اسی طرح افغانستان سے روسیوں کے انخلاء کے بعد جو غیر ملکی مجاہدین وزیرستان وغیرہ میں مقیم ہوگئے تھے، انہوں نے مقامی مجاہدین کے ساتھ مل کر حکومت پاکستان کے خلاف خروج کیا حالانکہ مقامی لوگ، صوبہ سرحد کے باسی اور عام پاکستانی اگرچہ حکومت پاکستان کی برائے نام اسلامی کوششوں سے غیر مطمئن تھے لیکن پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں (اور عوام) بہرحال پرامن طریقے سے حکومت کے کردار کو بدل کر اسلامی بنانے کے لیے کوشاں تھے اور پرامن طریقے سے جدوجہد کررہے تھے لیکن جہادی ٹریننگ رکھنے والے لوگوں نے اس صورت حال کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور غیر صالح پاکستانی حکمرانوں کی تکفیر کا اور ان کے خلاف خروج کا فیصلہ کرلیا۔

غرض یہ کہنا کہ جہاد فرد کی متوازن تعلیم و تربیت اور تزکیہ کرتا ہے، ایک مخدوش بات ہے اور مجاہدین کے رویے کو شرعی لحاظ سے مبنی بر سلامتی اور توازن رکھنے کے لیے بھی دعوت و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تو بالکل ہی غیر معقول بات ہے کہ خروج سے پہلے عوام، معاشرے اور حکمرانوں کی اصلاح کے لیے پرامن دعوت و تبلیغ کی ضرورت نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غیر صالح مسلم حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے پہلے ہر طرح سے عوام اور حکمرانوں کی اصلاح کی غرض سے اتمام حجت ضروری ہے بلکہ جیسا کہ ہم سطور بالا میں کہہ چکے ہیں کہ اگر افراد امت پر محنت کی جائے۔ دعوت و اصلاح، تعلیم و تربیت اور میڈیا کے ذریعے ان کی اصلاح کی جائے، اور اس کے نتیجے میں لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے لگیں تو **ھذا ھو المطلوب**. یہ فرد کی دنیوی اور اخروی کامیابی کے لیے کافی ہے اور معاشرے اور ریاست کی اصلاح کا کام بھی اس سے بڑی حد تک ہوجائے گا کہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ معاشرے اور ریاست کو الٰہی احکام کے مطابق ڈھالنے کا یہ ایک فطری طریقہ ہے اور یہی پیغمبرانہ سلوک اور منہاج ہے جو قرآن و سنت سے ثابت ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ غیر صالح مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج و بغاوت (جسے یہ لوگ 'جہاد' کہتے ہیں) سے پہلے دعوت و اصلاح، تبلیغ و تزکیہ اور تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کا اجراء ایک امر ضروری اور تقاضائے شرعی ہے تاکہ مسلمان عامۃ الناس، معاشرے کے موثر طبقات اور حکمرانوں کی اصلاح کے لیے پہلے پورا زور لگایا جائے۔ یہ کام کیے بغیر خروج اور قائم مسلم حکومت کا بزور تختہ الٹنا نہ صرف شرعاً جائز نہیں ہے بلکہ موجودہ حالات میں عملاً ناممکن ہے اور نہ ہی اس میں کامیابی کا تصور کیا جاسکتا ہے کیونکہ آج کل ہر ریاست کے

پاس سٹینڈنگ آرمی اور تربیت یافتہ پروفیشنل دفاعی افواج ہوتی ہیں اور غیر مسلم عالمی قوتوں کی پشت پناہی بھی انہیں حاصل ہوتی ہے لہٰذا اس طرح کی مسلح مزاحمت کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ کئی علماء اسے فتنہ (**والفتنة اشد من القتل**) اور بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں اور بہت سے علماء جوان مزاحمت کاروں سے ہمدردی رکھتے ہیں وہ بھی اسے بے سود جدوجہد اور خواہ مخواہ اللہ کی راہ میں قربانی قرار دیتے ہیں...... گو ہر آدمی کی نیت کا معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے اور اللہ ہی مالک یوم الدین ہے اور آخرت میں اپنے بندوں کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ نفاذ شریعت کے لیے غیر صالح مسلم حکومت کے خلاف جدوجہد (جہاد) کے نام پر فرد (عوام وخواص) کی اصلاح وتعمیر اور اس کے ذرائع (دعوت واصلاح، تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفوس) سے صَرفِ نظر کرنا غلط ہے اور یہ ہماری نہیں پاکستان کے جمہور علماء کی رائے ہے۔

(ii) مغربی تہذیب کے بارے میں رویہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے جہادی گروپ مغرب مخالف ہیں۔ ان کی قیادت میں کئی لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے اور ہیں جیسے اسامہ بن لادن یا ڈاکٹر ایمن الظواہری، افغان جہاد منظم کرنے والے ڈاکٹر عبداللہ عزام اور داعش کے نامزد کردہ خلیفۃ المسلمین بھی اسلامی علوم میں پی ایچ ڈی ہیں اور مغربی فکر وتہذیب کی زہرناکی کو خوب سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض جہادی گروپوں کی قیادت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں جیسے پاکستانی طالبان ہیں۔ افغان طالبان میں بھی زیادہ تر دینی مدارس میں پڑھنے والے یا فارغ التحصیل لوگ شامل ہیں۔ بظاہر مغرب بھی ان جہادی گروپوں کا مخالف ہے اور انہیں کچلنے کے لیے کارروائیاں کرتا رہتا ہے۔

تاہم یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ بہت سے تجزیہ کاروں اور محققین کی یہ رائے ہے (جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں) کہ امریکہ اور اس کے حلیفوں کی خفیہ ایجنسیاں ان جہادی گروپوں کے اندر دور تک گھسی ہوئی ہیں اور ان کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ ان کا یہاں تک کہنا ہے کہ یہ ایجنسیاں انہیں اپنی مرضی اور مفادات کے تحت بالواسطہ طور پر استعمال کرتی ہیں اور کر رہی ہیں مثلاً

- ۹/۱۱ کے امریکہ پر القاعدہ کے حملوں کے بارے میں بہت سے مغربی محققین اور تجزیہ کاروں کی یہ رائے ہے کہ یہ موساد اور سی آئی اے کا ڈرامہ تھا، جس میں انہوں نے القاعدہ کو استعمال کیا اور اس کے ذریعے انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دور رس کامیاب اقدامات کیے ہیں...... ہماری

رائے میں بھی، جب ان تفصیلات پر نظر ڈالی جائے، تو ان میں وزن نظر آتا ہے۔

- تحریک طالبان پاکستان کے بارے میں بھی اکثر اہل دانش کا مطالعہ و تجزیہ یہی ہے کہ ان کے پس پردہ امریکی و بھارتی لابی کام کر رہی ہے۔ اس کے شواہد کثیر ہیں جنہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

- داعش (عراق و شام کی اسلامی حکومت یا ISIS) نامی مجاہد گروپ کے بارے میں بھی شواہد یہی بتاتے ہیں اور ان کے پاس جو جدید ترین تربیت اور اسلحہ ہے اور یہاں تک کہ ڈرون، ٹینک اور جنگی طیارے بھی ہیں ان کے پس پردہ بھی امریکی اور یورپی ممالک ہیں اور وہ شیعہ اور سنی کو باہم لڑا کر عراق کو تباہ کر رہے اور مسلمانوں کو کمزور کر رہے ہیں۔

- شام میں بھی صورت حال یہی ہے کہ امریکہ بشارالاسد کے خلاف ہے۔ القاعدہ بھی اسد کے خلاف لڑ رہی ہے۔ بشار کے حق میں ایران اور روس ہیں لہٰذا امریکہ کی بالواسطہ اعانت القاعدہ کو حاصل ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ اس کی اتنی مدد نہیں کرتا کہ وہ وہاں کامیاب ہو کر ایک اسلامی ریاست قائم کر لے لہٰذا وہاں بھی وہ شیعہ سنی کو لڑا کر اور ملک میں خانہ جنگی جاری رکھ کر اسے تباہ کر رہا ہے تا کہ وہ کبھی اسرائیل کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ شام میں اگر داعش کامیاب ہونے لگے تو امریکہ اس کے خلاف بھی حرکت میں آ جاتا ہے۔

غرض یہ کہ بظاہر اس امر کے باوجود کہ مجاہدین گروپ امریکہ و مغرب کے خلاف ہیں اور امریکہ ان پر حملے بھی کرتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ امریکہ ان گروپوں کے اندر گھس کر انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال بھی کرتا ہے اور یہ مفادات یقیناً اسلام اور مسلم دشمنی پر مبنی ہیں۔

iii- باہمی تعاون

مجاہدین گروپوں میں بھی یہ خرابی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ وہ صرف اپنے منہاج کو درست سمجھتے ہیں اور دعوت و تبلیغ میں مصروف یا پر امن سیاسی جدوجہد میں مشغول دینی سیاسی جماعتوں کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ حق کو وہ اپنے منہج میں محصور سمجھتے ہیں، غیر صالح حکمرانوں اور مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں اور دعوتی و سیاسی جدوجہد کو حقیر گردانتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ مختلف جہادی گروپ آپس میں بھی لڑتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کا خون بہاتے رہتے ہیں۔

ان جہادی گروپوں کے اس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں اور دعوتی و اصلاحی جماعتوں اور دینی

سیاسی جماعتوں میں کوئی تعاون، رابطہ یا مشاورت نہیں پائی جاتی بلکہ ان کے درمیان بُعد اور فاصلہ پایا جاتا ہے جو عوام اور امت کو تقسیم کرتا ہے اور دور رس دینی مفادات کو نقصان پہنچاتا ہے۔

۶- پس چہ باید کرد

سطور بالا میں ہم نے اپنے ہاں کی دینی قوتوں (دعوتی تحریکوں، دینی مدارس، دینی سیاسی جماعتوں اور مجاہدین کی تنظیموں) کے لائحہ ہائے عمل کا جو تجزیہ کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ بلاشبہ یہ دینی قوتیں مصروف عمل ہیں، ان کی جدوجہد مبارک ہے اور ہمارے معاشرے میں دین سے جو وابستگی پائی جاتی ہے وہ بلاشبہ انہی کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔ اس کے لیے یہ دینی قوتیں مستحق تبریک وحوصلہ افزائی ہیں...... لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابھی کرنے کو بہت سا کام باقی ہے۔ بہت سے شعبوں میں کامیابی نہیں مل سکی۔ کئی شعبوں میں کام کے نتائج وہ نہیں نکلے جو متوقع تھے۔ پھر بگاڑ کی قوتیں بوجوہ زیادہ طاقتور اور فعال ہیں وہ بھی زور شور سے کام کر رہی ہیں...... لہٰذا معاشرے میں دین سے دوری بڑھ رہی ہے، مغربی اصول واقدار معاشرے پر غالب آ رہی ہیں، اخلاقی بگاڑ فزوں تر ہے۔ معاشرے اور ریاست کے مقتدر اور موثر طبقات ان غیر ملکی اور غیر اسلامی قوتوں کے فکری یرغمال اور عملی گماشتے بنے ہوئے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو فکری اور عملی غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا بگاڑ میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے بلکہ بعض اوقات تو خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ حالات کی کوئی بڑی لہر ہماری دینی قوتوں کو اٹھا کر پٹخ نہ دے اور ہم خدانخواستہ سیکولرزم، لبرلزم اور ویسٹرنائیزیشن کی نذر نہ ہو جائیں۔

ان حالات میں بچنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہماری دینی قوتیں اپنی حکمت عملی اور لائحہ عمل پر، ہماری گزارشات کی روشنی میں، نظر ثانی فرمائیں اور فرد کی تعمیر وتشکیل شخصیت کو اہمیت دیں، مغربی تہذیب کے فکری وعملی غلبے کے رد کو اپنے منہج کا حصہ بنائیں اور حق کو اپنے مسلک ومنہج میں محصور سمجھنے کی بجائے دوسری دینی قوتوں کے ساتھ مشاورت وتعاون کو بڑھائیں اور اجتہادی وفروعی اختلافات کو نظر انداز کر کے دین کے وسیع تر مفادات کو مقدم رکھیں۔ اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو یہی مطلوب ہے۔ تاہم جیسا کہ ہم سب کا تجربہ ومشاہدہ ہے کہ جو لوگ جس ڈھب پر کام کر رہے ہوتے ہیں اس میں تبدیلی پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے۔

۷- تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی کے لیے نیا لائحہ عمل

ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تعمیر فرد اور سماجی تبدیلی کے لیے نئی کوششوں کی داغ بیل ڈالی جائے۔ یہ کام کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

تعمیر فرد اور کردار سازی

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر ان اسلامی اصولوں کے مطابق کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں نازل فرمائے ہیں اور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ان پر عمل کر کے ہمیں دکھایا ہے۔ یہ وہ عالمگیر اصول ہیں جنہیں پہلے انبیاء نے بھی اپنے مخاطب افراد اور قوموں کی اصلاح و تعمیر کے لیے استعمال کیا اور آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے انہی اصولوں پر عمل کا حکم دیا۔ یہ اصول، اختصاراً، دو ہیں:(۱) ۱- تعلیم کتاب و حکمت؛ اور ۲- تزکیۂ نفس

۱- تعلیم کتاب و حکمت

تعلیم کتاب تو واضح ہے کہ قرآن حکیم اللہ کی کتاب اور زمین پر اس کی برہان ہے جس کی قیامت تک حفاظت کی ذمہ داری اس نے خود لی ہے۔ یہ کتاب چونکہ منبع ہدایت ہے لہٰذا ہر وہ شخص جو خود کو مسلمان کہتا ہے اس کی تعلیم حاصل کرنے کا مکلّف ہے کہ اسی پر اس کی ہدایت کا انحصار ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سنت و سیرت بھی گویا اسی کا ایک حصہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کے رسمی شارح اور اس پر عمل کر کے دکھانے کے مکلّف ہیں اور چونکہ آپ ﷺ کو وحی کی صیانت میسر تھی لہٰذا اس کتاب کی تفہیم اور اس پر عمل میں آپ ﷺ سے کسی غلطی کا صدور ممکن نہ تھا۔ اس لیے امت کا اس پر اجماع ہے کہ سنت رسول بھی قرآن مجید کے ساتھ دین کا بنیادی ماخذ ہے۔ لہٰذا قرآن و سنت کی تعلیم نہ صرف مسلمانوں کے نظام تعلیم کا سب سے بڑا جزو ہے بلکہ یہ سارے نظام تعلیم کی بنیاد ہیں یعنی سارے علوم مکتسبہ (علوم آلیہ [قرآن و حدیث کے معاون علوم]، عمرانی علوم اور سائنس و ٹیکنالوجی......وغیرہ) بھی قرآن و سنت کی روشنی میں مدوّن کیے جانے چاہئیں اور وہ صرف اسی صورت میں قابل قبول ہوں گے جب وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوں اور ان کے خلاف نہ ہوں۔

۱- کئی جگہ 'تلاوت آیات' کے الفاظ بھی آئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کا پڑھنا بھی اس کی تعلیم ہی کا ایک حصہ ہے اسی طرح تعلیم میں کتاب و حکمت دونوں کی تعلیم کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم نے اختصاراً چار کی بجائے انہیں دو اصولوں میں شمار کر لیا ہے۔

ہمارے تعلیمی نظام کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ثنویت پر مبنی ہے یعنی مذہبی تعلیم الگ اور دنیاوی علوم کی تعلیم الگ جب کہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق سرے سے موجود ہی نہیں لہٰذا تعلیم کا یہ سیکولر تصور غلط اور گمراہ کن ہے اور نظام تعلیم کی وحدت ہماری اوّلین ضرورت ہے۔ اسی طرح ہماری جدید تعلیم ساری کی ساری مغرب زدہ ہے اور مغربی تصورات پر مبنی ہے لہٰذا جب تک اس مغربیت کو رد نہ کیا جائے اور تعلیم کو عصری تقاضوں کے مطابق اسلامی تناظر میں نہ ڈھالا جائے، اپنی موجودہ صورت میں وہ حتماً ضرر رساں ہے اور فکری یکسوئی سے محروم بے کردار انسان پیدا کر رہی ہے اور یکسو مسلم شخصیت پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی جو اپنی جدتِ فکر اور جرأتِ کردار سے زمانے کی امامت کر سکے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہمارا نظام تعلیم سارے کا سارا (یعنی تعلیمی انتظامیہ، تربیت اساتذہ، نصاب، تربیت طلبہ، ہم نصابی سرگرمیاں ...... وغیرہ) محتاج نظر ثانی ہے اور جب تک اس کی اصلاح نہ کی جائے اس کی توسیع و اشاعت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ وہ مسلم فرد اور معاشرے و ریاست کے لیے مفید ہوگی۔

تعلیم کی وحدت، اسلامی اصولوں پر اور عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تشکیل نو، تعلیم کے مغربی اصول و اقدار کا ردّ، اسلامی تربیت کا اہتمام ......ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے دینی مدارس اور جدید سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے نصابات و نظام میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟ یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہ ہماری کئی مستقل کتابوں کا مرکزی موضوع ہے اور جن اصحاب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ تفصیلات کے لیے ہماری مندرجہ ذیل کتابیں دیکھ سکتے ہیں:

- ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
- تعلیمی ادارے اور کردار سازی
- ہمارا دینی نظام تعلیم
- تربیت طلبہ: مینوئل و گائیڈ

میڈیا کا کردار: رسمی اور باقاعدہ (Regular) تعلیم کے علاوہ غیر رسمی تعلیم بھی اہم ہوتی ہے اور ہمارے عہد میں پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا نے ایک طاقتور اور موثر ذریعہ ابلاغ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور چونکہ اس کی باگ ڈور اسلام و مسلم دشمن مغربی قوتوں اور یہودیوں کے ہاتھ میں ہے لہٰذا وہ مسلم معاشرے کے اصول و اقدار کی تباہی اور نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ لہٰذا اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ میڈیا سے اسلامی تناظر میں مسلم شخصیت کی اصلاح و تعمیر کا بنیادی کام لیا جائے۔

تزکیۂ نفس

فرد کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں تعلیم کے بعد دوسرا اہم ترین عنصر تزکیۂ نفس کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب وحکمت کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ شخصیت اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھلتی چلی جائے اور فرد کے لیے قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنا آسان وسہل ہوجائے۔ یہ عمل اگر باقاعدہ تعلیم کا جزو ہوتو آج کل تعلیمی اصطلاح میں اسے تربیت کہتے ہیں۔ اسی لیے کئی عرب مسلم ممالک میں وزارت تعلیم کا نام 'وزارة التربية والتعليم' رکھا گیا ہے گویا تربیت نہ صرف تعلیم کا جزو لاینفک ہے بلکہ تعلیم کی غایت ہی تربیت وتزکیۂ نفس ہے اور اس کے بغیر تعلیم ایک ناقص اور بے معنی عمل ہے۔

بڑوں (Grown UPS) کے لیے مسلم روایت میں ایک خصوصی ادارہ مسلمانوں نے قائم کیا جسے 'تصوف' کہا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہی تھا کہ افراد کا تزکیہ کیا جائے اور رسمی تعلیم کے دوران یا ریاست اور معاشرے کے غلط اثرات کے تحت اگر فرد الٰہی ہدایت کے مطابق زندگی نہ گزار سکے یا معصیت میں مبتلا ہوجائے تو تصوف کے ادارے سے مدد حاصل کرکے اپنے نفس کا تزکیہ کرسکے۔ شروع میں یہ ادارہ اسلامی اصولوں کے عین مطابق اور بہت موثر تھا اور اس نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی زندگی میں انقلاب برپا کیا لیکن رفتہ رفتہ اس میں غیر اسلامی افکار ونظریات کی آمیزش ہوتی گئی اور غیر اسلامی رسوم ورواج نے اس میں راہ پائی۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ صحیح اسلامی خطوط پر اس ادارے کی تجدید کی جائے اور اسے پھر خالص شرعی اصولوں پر مدوّن کرکے فعال کیا جائے۔

۲- سماجی تبدیلی

فرد کی شخصیت کی صحیح اسلامی خطوط پر استواری ہی دراصل دنیا وآخرت کی فلاح کی کنجی ہے۔ اسلامی فکر میں آخرت دنیوی زندگی سے اہم تر ہے اور ترجیح میں بھی اس سے اوّل ہے اور آخرت میں انسان کو بحیثیت ایک فرد اللہ کے حضور جوابدہ ہونا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں کامیابی یا ناکامی اور جزا یا سزا کا مستحق ہونا ہوتا ہے لہٰذا اجتماعی زندگی اگرچہ اہم ہے لیکن اس کی اہمیت کا جواز اور وجہ ہی یہ ہے کہ وہ فرد کو صراط مستقیم پر چلنے اور قائم رہنے میں مدد دیتی ہے لہٰذا فرد کی اگر صحیح خطوط پر تربیت ہوجائے تو لامحالہ اس کے مثبت اثرات اجتماعی زندگی یعنی معاشرے اور ریاست پر بھی پڑتے ہیں کیونکہ وہ افراد سے مل کر بنتے ہیں۔ معاشرہ انسانی معاشرت واجتماعیت کا پہلا زینہ اور مظہر ہے جب کہ ریاست کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ فرد کی تعمیر واصلاح اگر صحیح اسلامی خطوط پر ہوجائے تو اس کا اظہار سب سے پہلے معاشرتی تبدیلی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور اس کے بعد ریاست کا نمبر آتا ہے گویا تعمیر واصلاح کی منطقی اور فطری

ترتیب اپنی اہمیت اور فعالیت کے حوالے سے یوں ہے: فرد ← معاشرہ ← ریاست۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ریاست کسی وجہ سے افراد کی امنگوں اور آدرشوں کا ساتھ نہ بھی دے تو معاشرہ اپنی ادارتی تنظیم کے ذریعے بڑی حد تک ریاست کے ایک متبادل کے طور پر سامنے آتا ہے جس کی ایک ٹھوس مثال یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جب ریاست عوامی امنگوں اور آدرشوں کا ساتھ نہ دے سکی تو مسلم معاشرے نے تعلیم اور قانون سازی کے دو اہم ترین شعبے ریاست کے حوالے نہ کیے بلکہ معاشرتی ادارتی تنظیم کے ذریعے انہیں ایک ہزار سال تک کامیابی سے چلا کر دکھایا جب تک کہ مغربی استعمار نے مسلم معاشرے و ریاست کو تلپٹ کر کے نہیں رکھ دیا۔ عصر حاضر میں بھی مسلم ریاست، مغربی فکر و تہذیب کے غلبے اور دباؤ کی وجہ سے چونکہ اپنی سیادت عوامی امنگوں اور تقاضوں کے مطابق بروئے کار نہیں لا سکی اور مسلم معاشرہ سخت زبوں حالی کا شکار ہے (اور یہ ایک دو برس کی بات نہیں یوں صدی کا تجربہ ہے) لہٰذا ہم یہ تجویز دے رہے ہیں کہ مندرجہ ذیل تین اہم شعبوں میں معاشرتی ادارتی تنظیم کے ذریعے اس خلا کو پُر کیا جا سکتا ہے۔ شرعی لحاظ سے اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں اور قرآن و سنت کی نصوص پر استوار ہیں۔ مسلم روایت میں اسے عام طور پر 'خدمت خلق' سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے:

۱- افلاس میں کمی (یتیموں، غریبوں، مسکینوں، بیواؤں کی مدد)

۲- حصول انصاف (مظلوموں، مجبوروں، مقہوروں کی اعانت - قانون شریعت پر عمل کے ذریعے)

۳- بحالیٔ امن وامان (چوری، ڈکیتی اور استحصال سے بچاؤ)

۱- افلاس میں کمی: مسجد میں اقتصادی کمیٹی بنا کر محلے کی سطح پر بیواؤں، یتیموں، مساکین کی فہرستیں بنا کر اہل محلّہ کے عطیات سے ان کی گزر بسر کی صورت نکالی جا سکتی ہے۔ ملکی سطح پر ایک مرکزی زکوٰۃ کونسل بنا کر اور عوام کے قابل اعتماد اور صاحب کردار افراد کے ذریعے، زکوٰۃ، عشر اور صدقات کے کروڑوں روپے جمع کر کے اور ان کی تقسیم کا شفاف نظام بنا کر، بغیر حکومتی مدد کے، غرباء و مساکین کی مدد کے بیسیوں منصوبے بنائے اور چلائے جا سکتے ہیں۔ مضاربت و مشارکت کے بے شمار منصوبے زیر عمل لائے جا سکتے ہیں، سود لینے دینے کے قبیح جرم سے بچا جا سکتا ہے اور تجارتی ڈھانچے کو اسلامی بنیادوں پر چلایا جا سکتا ہے۔

۲- عدل وانصاف کی فراہمی: مسجد میں دین دار وکلا، ریٹائرڈ جج صاحبان، امام وخطیب اور معززین علاقہ کے چیدہ افراد پر مشتمل ایک مصالحتی کمیٹی یا شرعی عدالت بنائی جا سکتی ہے جو مصالحت اور

ثالثی کے ذریعے (اور یہ دونوں آئینی ادارے ہیں) اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔ یہ فیصلے جلد ہوں گے اور سستے ہوں گے اور یہی چیز درکار ہے۔ ان شرعی عدالتوں کے اوپر بڑے شہروں اور علاقوں میں اپیل عدالتیں بھی بنائی جاسکتی ہیں جو انہی اصولوں پر کام کریں گی اور اس طرح پاکستان کے غریب اور مظلوم عوام کی کچھ دادرسی ہو سکے گی۔

۳- امن و امان کی بحالی: مذکورہ طرز پر مسجد میں ایک امن کمیٹی بنائی جاسکتی ہے جس کے تحت نوجوان اپنی مدد آپ کے تحت راتوں کو جاگ کر باری باری پہرہ دیں گے اور دن کے وقت بھی آتے جاتے گلی محلے پر نظر رکھیں گے تاکہ چوروں، ڈاکوؤں سے نجات ملے اور سٹریٹ کرائمز کا خاتمہ ہو سکے۔

اسی طرز پر معاشرتی فلاحی کمیٹی بنائی جاسکتی ہے جو گلی محلے میں پانی اور روشنی کے انتظام، نکاسیٔ آب، مناسب تعلیمی اداروں میں بچوں کے داخلے میں مدد، فری ٹیوشن سنٹرز کے قیام جیسے کام کرسکتی ہے۔ تحفظ اخلاق کمیٹی بنائی جاسکتی ہے جو نوجوانوں کو محلے میں مفید اور تعمیری سرگرمیاں مہیا کرے جیسے لائبریری چلانا، مباحثوں اور اسلامی تقریبات کا انعقاد، گلی کی نکڑ پر کھڑے ہونے والے لڑکوں کو تنبیہ...... وغیرہ۔ اشاعت دین کمیٹی بنائی جاسکتی ہے جو گلی محلے میں قرآن ناظرہ، تجوید، ترجمہ اور تحفیظ کا انتظام کرے۔ درس قرآن و حدیث کے حلقے مسجد یا کسی گھر کے ڈرائنگ روم میں رکھے جاسکتے ہیں۔ دینی تقریبات مل کر منعقد کی جاسکتی ہیں۔ وغیرہ۔

ہماری تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اس وقت دینی مدارس اور مساجد بغیر حکومتی مدد کے پرائیویٹ سیکٹر چلا رہا ہے، اسے دوسرے اہم شعبوں تک توسیع دے دی جائے اور جس حد تک انہیں معاشرتی اداروں کو منظّم کرکے چلایا جاسکتا ہو، چلایا جائے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ دین پر عمل اور اس کی اقامت جیسے بنیادی مسئلے کو، جس کا تعلق ہماری دنیا اور اس سے بڑھ کر ہماری آخرت سے ہے، اسے ہم ریاست کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑیں؟ کیوں نہ ہم فرد کی اسلامی تعلیم و تربیت کریں اور معاشرتی سطح پر اسے منظّم کرکے دینی مقاصد حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔

۸- اس کام کا طریق کار

پہلا طریقہ: وہ دینی قوتیں جو اس وقت کام کر رہی ہیں اور معاشرے میں روبہ عمل ہیں (خصوصاً دعوتی تحریکیں، دینی مدارس، دینی سیاسی جماعتیں اور جہادی تنظیمیں) ان کو توجہ دلائی جائے کہ وہ اپنے لائحہ عمل پر، ہماری ان گزارشات کی روشنی میں، نظر ثانی فرمائیں۔ مطلب یہ کہ دین کی خدمت جو وہ کر رہے ہیں، وہ اسے جاری رکھیں لیکن جن امور کی طرف ہم نے توجہ دلائی ہے ان پر بھی غور فرمائیں اور

ہو سکے تو اپنے پروگراموں میں انہیں ایڈجسٹ کریں۔ خدمت دین کے جس اسلوب کو وہ اہم اور موزوں سمجھتے ہیں اسے وہ ترک نہ کریں لیکن جو تجاویز ہم نے دی ہیں ان کو بھی اپنے لائحہ عمل کا ایک جزو بنالیں اور دوسرے دینی کاموں کے ساتھ ان کو بھی اپنے کاموں کا ایک حصہ بنالیں۔

اگر ہم ان قوتوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہوجائیں کہ جن امور کی طرف ہم نے ان کی توجہ مبذول کرائی ہے، وہ بھی دینی لحاظ سے کرنے کے اہم کام ہیں تو یہ ایک بڑی کامیابی ہے اور اس کے موثر نتائج نکل سکتے ہیں۔

دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ افراد معاشرہ کو ان کاموں کے لیے متحرک کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچا جائے اور ان تک اپنا پیغام پہنچایا جائے اور ان سے یہ درخواست کی جائے کہ ان میں سے ہر فرد اپنی صلاحیت، وسعت اور ذوق کے لحاظ سے ہمارے مجوزہ کاموں میں سے جس پر آسانی سے کام کرسکتا ہو، وہ اس پر عمل شروع کردے۔

اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ پہلے ایک جماعت کھڑی کی جائے، اس کا ایک نام رکھا جائے، اس کا ایک دستور بنایا جائے، اسے حکومت کے پاس رجسٹرڈ کرایا جائے، اس کے صدر، سیکرٹری اور دوسرے عہدیدار مقرر کیے جائیں...... وغیرہ- مغربی طرز کی اس جماعت سازی نے مسلم معاشرے کو ڈیلیور کم کیا ہے اور دھما چوکڑی زیادہ مچائی ہے۔ تبلیغی جماعت نے اس طرح کام نہیں کیا اور وہ پھر بھی کامیاب ہے۔ لوگوں نے اس کا کام دیکھ کر اسے تبلیغی جماعت کہنا شروع کردیا ورنہ اس کے بانی نے اس کا کوئی نام نہ رکھا تھا۔ یہی حال ترکی کے فتح اللہ گولن کا ہے کہ انہوں نے تعلیم اور خدمت خلق کا کام شروع کردیا جو آہستہ آہستہ معاشرے میں پھیل گیا بعد میں لوگوں نے اسے 'تحریک خدمت' کہہ کر پکارنا شروع کردیا حالانکہ بانی نے اس کا کوئی نام نہ رکھا تھا اور تنظیمی ڈھانچہ قائم کر کے اس کا آغاز نہ کیا تھا۔ ہماری خواہش ہے کہ تعمیر فرد (بذریعہ تعلیم وتربیت، میڈیا اور تزکیۂ نفس) اور سماجی تبدیلی (خاتمہ افلاس، حصول انصاف اور بحالیٔ امن و امان) کے شعبوں میں کام کرنے کی جو تجویز ہم دے رہے ہیں، یہ بات معاشرے میں عام طور پر پھیل جائے اور ہر آدمی اپنے ذوق اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے کسی نہ کسی ایک کام کا آغاز کردے تو یوں سمجھیے کہ تحریک شروع ہوگئی۔ باہمی رابطے، مشاورت اور تبادلۂ تجربات کے لیے کوآرڈینیشن کی کوئی ہلکی پھلکی صورت نکالی جاسکتی ہے۔ هذا من عندنا والعلم عندالله .

منہج غلبۂ دین **مولانا زاہد الراشدی**

میری بھی تو سنیے!

میں دہشت گرد نہیں ہوں

ایک مجاہد کا موقف

میں ایک مسلمان ہوں اور قرآن وسنت پر ایمان رکھتا ہوں۔ مجھے قرآن وسنت میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان معاشرے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول ﷺ کے احکامات وفرامین کی عمل داری قائم ہونی چاہیے اور ایک مسلمان حکومت کو اس کو اہتمام کرنا چاہیے۔ میں قرآن وحدیث کو کسی دینی مدرسے میں پڑھوں، کالج اور یونیورسٹی میں اس کی سہولت میسر آ جائے یا قرآن وسنت کی تعلیمات تک رسائی کا کوئی اور ذریعہ مل جائے، احکام وقوانین اور نظام کے متعلق قرآن وسنت کی تصریحات میں مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اور دنیا میں کہیں بھی چلا جاؤں ان کے معنی ومفہوم میں یکسانی ہی دکھائی دیتی ہے لیکن جب عملاً دیکھتا ہوں تو مجھے یہ عمل داری کسی مسلمان معاشرے میں نظر نہیں آتی اور کوئی مسلمان حکومت اس کے لیے تیار دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے بتایا جاتا ہے کہ مسلمان حکومتیں اس وجہ سے اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ آج کا عالمی نظام ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا اور مروجہ بین الاقوامی سسٹم اور معاہدات میں اس کی گنجائش موجود نہیں ہے۔

میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کے ہر ملک میں عوام کو یہ حق دیا گیا ہے کہ ان کی اکثریت اپنے وطن کے لیے جس نظام کو پسند کرے اور جن احکام وقوانین کو نافذ کرنا چاہے، انہیں اس کا حق حاصل ہے لیکن کسی مسلمان ملک کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جا رہا کہ اس کے عوام کی اکثریت خود اپنے ملک میں اپنے دین و مذہب کے احکام وقوانین کا نفاذ کر سکے۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ الجزائر اور مصر میں عوام کے اکثریتی فیصلوں کو مسترد کر کے ان پر آمریت مسلط کر دی گئی ہے اور پاکستان کے عوام کی اکثریت اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے نفاذ اسلام کا دستوری حق حاصل کرنے کے باوجود اس سے محروم ہے بلکہ سیکولر عالمی فورمز پاکستانی عوام کے منتخب نمائندوں کے طے کردہ اس دستور کو ختم کرانے کے درپے ہیں۔

یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ دو مسلمان ملکوں انڈونیشیا اور سوڈان کی تقسیم ہوئی ہے اور غیر مسلم مسیحی آبادی کو اکثریتی مسلم آبادی سے الگ کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے ذریعے ریفرنڈم کروا کر ان کی الگ ریاستیں قائم کر دی گئیں ہیں لیکن کشمیر میں اقوام متحدہ کے باضابطہ فیصلہ کے باوجود اس ریفرنڈم

سے عمداً گریز کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں بین الاقوامی معاہدات اور جنرل اسمبلی کی قراردادیں عالمی استعمار کے سامنے بے بسی کی تصویر بنی ہوئی ہیں۔

فلسطین میں وہاں کی قدیم آبادی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، میں اسے نہیں بھول سکتا۔ اسرائیل گزشتہ نصف صدی سے امریکا اور یورپ کی سرپرستی بلکہ پشت پناہی سے مظلوم فلسطینیوں پر ظلم وستم کا جو بازار گرم رکھے ہوئے ہے اس سے عالمی امن کے چودھریوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور خاموشی کے ساتھ یہ انتظار جاری ہے کہ آہستہ آہستہ فلسطینیوں کی قوت مزاحمت بلکہ ان کا وجود ہی ختم ہو جائے تاکہ پورے مشرق وسطی پر اسرائیل کی چودھراہٹ مسلط کرنے اور مسلمانوں کے قبلۂ اول مسجد اقصیٰ کے بارے میں عالمی استعمار کے ایجنڈے کو مکمل کرنے کی راہ ہموار ہو۔

مجھے یہ کہا جا رہا ہے کہ فلسطین ہزاروں سال قبل یہودیوں کا وطن تھا، اس لیے اس زمین پر ان کا حق ہے لیکن کوئی یہ بتانے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اندلس پر مسلمانوں نے کئی صدیاں حکومت کی ہے، وہاں ان کا حق کیوں نہیں ہے؟ اور بنگلا دیش کے پڑوس میں اراکان پر صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے، آج بھی اس پٹی میں مسلم آبادی اکثریت میں ہے لیکن انہیں وہاں کا باشندہ تسلیم نہیں کیا جا رہا اور انہیں بے وطن کرنے کے لیے قتل وغارت اور ریاستی دہشت گردی کا عذاب ان پر مسلط کیا گیا ہے، اس پر اقوام متحدہ زبانی جمع خرچ سے آگے کیوں نہیں بڑھ رہی؟

افغانستان میں روسی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد شروع ہوا تو اس میں میری شرکت کو سراہا گیا۔ مجھے مجاہد قرار دیا گیا۔ میری حمایت وامداد کے لیے پوری دنیا ایک طرف ہو گئی اور مجھے حریت پسند اور فریڈم فائٹر کے خطابات سے نوازا گیا لیکن میں نے اسی افغانستان میں امریکی فوجوں کی آمد اور تسلط کے خلاف ہتھیار اٹھائے تو مجھے دہشت گرد قرار دے دیا گیا اور میں دنیا کا سب سے بڑا مجرم قرار پا گیا ہوں۔

مجھے یہ کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی نظام کے خلاف ہتھیار اٹھانا جرم ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان ملکوں میں مسلمان حکومتوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے لیکن اس سوال کا کوئی بھی جواب نہیں دے رہا کہ بین الاقوامی نظام یک طرفہ جارحیت کا سب سے بڑا ہتھیار بن جائے تو پھر بے بس اور مظلوم قوموں کے پاس ہتھیار اٹھانے کے سوا کیا چارۂ کار باقی رہ جاتا ہے؟ اور اس عقدے کا حل بھی کوئی پیش نہیں کر رہا کہ مسلمان ملکوں میں مسلمان عوام کے منتخب نمائندوں کے جمہوری فیصلوں کو طاقت کے زور پر مسترد کر دیا جائے تو مسلم عوام اپنے فیصلوں کی بحالی کے لیے کیا راستہ اختیار کریں؟

میرا عقیدہ ہے اور صرف میرا عقیدہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے تمام فقہی مذاہب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ

'خلافت اسلامیہ' کا قیام ملت اسلامیہ کا اجتماعی دینی فریضہ ہے، جب کہ عملی صورت حال یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں اسلامی خلافت یا امارت کے قیام کو برداشت نہیں کیا جا رہا، بلکہ اوباما اور ٹونی بلیئر جیسے عالمی لیڈر برملا کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو خلافت قائم نہیں کرنے دیں گے۔

میرا مقدمہ سادہ سا ہے: (۱) مسلمان ممالک میں غیر ملکی مداخلت کا سلسلہ بند کر کے ان کے عوام کو اپنے نظام وقوانین کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے اور ان کے اجتماعی فیصلوں کو مسترد کرنے کا مکروہ سلسلہ ختم کیا جائے (۲) عالمی لیڈر اور حکومتیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف بین الاقوامی معاہدات کی آڑ میں محاذ آرائی ختم کر کے مسلمانوں کے دین اور ثقافت کا احترام کریں۔ اور طاقت کے زور پر مسلم ممالک میں مغربی فلسفہ وتہذیب کو مسلط کرنے سے باز آ جائیں۔ (۳) فلسطین، کشمیر، اراکان اور دیگر ایسے مظلوم خطوں کے مسلمانوں کو ان کے مسلمہ حقوق دلوانے کا اہتمام کیا جائے اور منافقت کا سلسلہ ترک کر کے انہیں عملاً انصاف مہیا کیا جائے (۴) عراق اور افغانستان سے غیر ملکی فوجیں واپس بلائی جائیں اور مشرق وسطی کے عوام وممالک کو آپس میں لڑانے کی مذموم اور شرمناک سازش سے باز رہا جائے۔

مسلمان حکومتیں اور سیاسی قیادتیں اگر اس ایجنڈے پر سنجیدہ ہو جائیں اور عملاً بھی کچھ کریں تو مجھے ہتھیار اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اگر مسلمان حکومتیں بھی کچھ نہ کریں، مسلم ممالک کے عوام کے جمہوری فیصلوں کو بھی قوت کے بل پر سبوتاژ کیا جاتا رہے، اسلام اور اسلامی عقائد وروایات کے خلاف ثقافتی یلغار بھی روز بہ روز بڑھتی رہے اور مسلمانوں کی سیاسی قیادتیں بھی 'اسٹیٹس کو' پر قناعت کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں، تو پھر مجھے بتایا جائے کہ مَیں کیوں اپنے موقف اور ایجنڈے سے دست بردار ہو جاؤں؟ (بشکریہ روزنامہ اسلام)

تعلیم و تربیت ڈاکٹر محمد امین

تعلیم میں مغربی سامراجیت کے غلبے کے خلاف ابھرتی ہوئی عالمی تحریک

مطالعہ، خصوصی مجلّہ 'مغرب اور اسلام' شمارہ ۴۰ بعنوان

اعلیٰ تعلیم، تہذیبی بالادستی اور مغرب

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد اور جماعت اسلامی کی تعلیمی تحریک کو کئی لوگ مغرب زدہ سمجھ کر ان پر تنقید کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے بھی تو اسی انسٹی ٹیوٹ کے ایک علمی مجلّہ 'مغرب اور اسلام' کو اس سے ایک خوشگوار استثنا سمجھنا چاہیے جس کا تازہ شمارہ (نمبر ۴۰) بعنوان 'اعلیٰ تعلیم، تہذیبی بالادستی اور مغرب' اس وقت زیر بحث ہے۔ اس مجلّے کے مدیر معروف سکالر پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد ہیں جو اس پیشکش کے لیے مستحق تبریک ہیں۔ اللھم زدفزد .

ہم ربع صدی سے پاکستان میں تعلیم کی اسلامیت اور اس میں مغربیت کے غلبے کے ردّ پر کام کر رہے ہیں۔ جب سے البرہان کا اجراء ہوا ہے ہماری آواز کچھ لوگوں تک پہنچنے بھی لگی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ آواز نحیف ہے اور ہم تنہائی بھی محسوس کرتے ہیں کہ نہ غیر ہم سے راضی ہیں نہ اپنے ہی خوش ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ہم صحرا میں اذان دے رہے ہیں اور کوئی بہت غیر مانوس اور اجنبیت والی بات کہہ رہے ہیں اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ حالت صرف پاکستان کی نہیں بلکہ تقریباً سارے عالم اسلام کی ہے۔ بعض جگہوں پر تعلیم میں اسلامیت کی گنجائش تو کسی حد تک نکال لی گئی جیسے سعودی عرب اور ترکی کی گولن تحریک میں لیکن مغربیت کے رد کی ہمت ان کو بھی نہیں ہوئی۔ دو سال پہلے ہمیں ایران میں عمرانی علوم کی اسلام کاری پر طہران میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں جانے کا موقع ملا تو ہم نے دیکھا کہ ایران میں اسلامی انقلاب کے باوجود جامعات میں مغرب کی فکری استعماریت کے اثرات ابھی تک خاصے مستحکم ہیں اور وہ کانفرنس بھی حکومت نے نہیں بلکہ دینی وعصری تعلیم کے ایک ادارے نے بلائی تھی (گو اسے بعض مقتدر حکومتی حلقوں کی حمایت حاصل تھی)۔ وہاں ہماری ملاقات دو ہندو پروفیسروں (ڈاکٹر سی کے راجو اور پروفیسر کلاڈ الویرز) سے بھی ہوئی جو تعلیم میں مغربی سامراجیت کے ردّ پر مبنی اپنے موقف کی وجہ سے کانفرنس کے منتظمین کے چہیتے تھے اور انہوں نے کانفرنس کے اجلاسوں کو اس حوالے سے گرمائے بھی رکھا۔

مجلّہ ’مغرب اور اسلام‘ عام طور پر عالم اسلام اور مسلم معاشرے کے مسائل کے حوالے سے مغربی مفکرین کی آراء کو اردو ترجمے میں ڈھال کر پاکستانی قارئین کے لیے پیش کرتا ہے تاہم مجلّہ کے تازہ شمارے (شمارہ نمبر ۴۰) بعنوان ’اعلیٰ تعلیم، تہذیبی بالادستی اور مغرب‘ میں مجلّہ نے ملائشیا اور بھارت کے ان تعلیمی حلقوں کا ایک موثر تعارف پاکستانی قارئین کے لیے پیش کر دیا ہے جو تعلیم میں مغرب کی سامراجی فکر کے غلبے کے خلاف ہیں۔ ملائشیا میں اس کے روح رواں ایس ایم محمد ادریس ہیں جو سٹیزنز انٹرنیشنل‘ اور ’تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک‘ کے سربراہ ہیں اور تھرڈ ورلڈ ریسرجنس‘ (Third World Resurgence) کے نام سے جاری کردہ ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے بھارتی ادارے ملٹی ورسٹی پراجیکٹ کے ساتھ مل کر (جس کے کوآرڈی نیٹر مسٹر کلاڈ الویرز ہیں) ملائیشیا کی سائنس یونیورسٹی اور وزارت اعلیٰ تعلیم کی ایک اکیڈمی کے تعاون سے جون ۲۰۱۱ء میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس منعقد کی جس میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے وسیع النظر اہل علم و دانش تین روز تک اکٹھے بیٹھے اور اعلیٰ تعلیم میں استعماریت کے اثرات کے جائزے اور ان اثرات کے ازالے کے لیے متبادل طریقوں پر گفتگو کی۔ ساتھ ہی ان تجربات پر بھی گفتگو ہوئی جو دنیا کی مختلف جامعات میں پہلے ہی زیر عمل ہیں اور جواب زیادہ واضح ہدف یعنی اپنی اعلیٰ تعلیم کو استعماریت سے پاک کرنے کے تصور کے تحت آگے بڑھائے جا رہے ہیں۔

اس کانفرنس کے مقالات مجلّہ ’تھرڈ ورلڈ ریسرجنس‘ کے شمارہ اکتوبر نومبر ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئے جن کا ایک انتخاب مجلّہ ’مغرب اور اسلام‘ نے اردو ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس مجلّے میں بارہ مضامین شامل کیے گئے ہیں جن کے عناوین اور مصنفین کے نام ہی ان کے موضوعات کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱- ہماری جامعات: سامراجی نقطۂ نظر کی پرورش گاہیں
ایس ایم محمد ادریس: چیف ایڈیٹر، تھرڈ ورلڈ ریسرجینس، ملائیشیا

۲- علم کا تفاوت: ورلڈ سوشل سائنس رپورٹ ۲۰۱۰ء کا تجزیہ
ڈیریل میسر (Darryl RJ Macer): ریجنل ایڈوائزر برائے سوشل اینڈ ہیومین سائنسز، یونیسکو، بنکاک

۳- مغرب زدہ عمرانی علوم کا تنقیدی جائزہ
کلاڈ الویرز (Claude Alvares): کوآرڈی نیٹر، ملٹی ورسٹی پراجیکٹ، بھارت

۴- ’یورپی مرکزیت‘ کا مسئلہ
ایم شاہد عالم، پروفیسر اکنامکس، نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی، بوسٹن، امریکہ

۵- اعلیٰ تعلیم: اشرافیہ اور کاروباری طبقے کی خدمت گار

یوسف جے پراگلر (Yousef J Progler): استاد تقابلِ ثقافت و معاشرت (کمپیر یٹو کلچرز اینڈ سوسائٹیز)،
ریتوسومیکان ایشیا پیسفک یونیورسٹی، جاپان

۶- عمرانی نظریات کی تدریس اور مشرقی مفکرین

سید فرید العطاس: صدر شعبہ ملائے (Malay) اسٹڈیز اور ایسوسی ایٹ پروفیسر سوشیالوجی،
نیشنل یونیورسٹی، سنگاپور

۷- تاریخ: غیر مغربی پس منظر میں

وینے لال (Vinay Lal): پروفیسر تاریخ، دہلی یونیورسٹی، بھارت اور کیلیفورنیا یونیورسٹی، لاس اینجلس، امریکہ

۸- قانون: نو آبادیاتی نظام سے آزادی

شادریک گوٹو (Shadrack Gutto): ڈائریکٹر، انسٹی ٹیوٹ فار امریکن رینائسنس اسٹڈیز،
ساؤتھ افریقہ یونیورسٹی، پریٹوریا، جنوبی افریقہ

۹- کیا سائنس واقعی 'مغربی' ہے؟

سی کے راجو (CK Raju): پی ایچ ڈی، انڈیانا اسٹیٹسٹکل انسٹی ٹیوٹ، امریکہ

۱۰- سَوراج یونیورسٹی: نو آبادیاتی اثرات سے نجات کا تجربہ

مینش جین (Manish Jain): شریک مؤسس (Co-founder)، سوراج یونیورسٹی، اودے پور، بھارت

۱۱- جنوبی افریقہ کی ایک خالص افریقی یونیورسٹی

مولیفی کیٹ اسانتے (Molefi Kete Asante): پروفیسر شعبہ افریقن امریکن اسٹڈیز،
ٹمپل یونیورسٹی، فلاڈیلفیا، امریکہ

۱۲- تعلیمی سامراجیت

سی کے راجو

۱۳- مروجہ نظامِ اور مسلم تناظر

خالد بیگ: مصنف اور دانشور، سافٹ ویئر انجینئر، امریکہ

آخری مضمون پاکستانی نژاد امریکی دانشور خالد بیگ صاحب کا ہے جو اس کانفرنس میں پیش نہیں کیا گیا تھا لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قابل تھا کہ اسے اس شمارے میں شامل کیا جائے۔ جناب ایس ایم ادریس کا نقطۂ نظر ہم 'مغرب اور اسلام' کے شکریے کے ساتھ اس شمارے میں ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

ہمیں جاننے والے اور البرہان کے قارئین اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہم عرصہ دراز سے

پاکستان میں عمرانی علوم کی ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کا خواب دیکھ رہے ہیں جس کی جڑیں مسلمانوں کی علمی روایت اور مقامی ثقافت میں پیوست ہوں اور وہ مغرب کی فکری سامراجیت سے آزاد ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم اس طرح کی یونیورسٹی عملاً قائم کر کے اس کے اچھے نتائج دکھا نہیں دیتے اس وقت تک ہماری عام جامعات مغرب کی فکری غلامی کی زنجیر توڑنے کا سوچیں گی بھی نہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کے دانشور، علماء، حکام اور اصحاب ثروت حضرات اس طرح کی یونیورسٹی کے قیام کی اہمیت کو محسوس کریں اور اس کے قیام کے لیے عملی اقدامات کرنے کا سوچیں۔ **و آخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین .**

البرہان میں لکھنے والوں کی خدمت میں

۱- مضمون کمپوز شدہ ہو اور البرہان کے آٹھ صفحات سے زیادہ نہ ہو۔ موضوع بہت اہم اور طویل ہونے کی صورت میں دو قسطوں میں چھپنے کے لیے ۱۶ صفحات سے زیادہ کا نہ ہو۔

۲- مضمون ای میل کے ذریعے بھیجا جائے۔ ڈاک کی صورت میں مضمون کی فوٹو کاپی بھجوانے کے بعد بطور احتیاط SMS پر اطلاع دے دی جائے۔

۳- مضمون ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک مل جانا چاہیے کیونکہ پرچہ ۲۰ تاریخ کو پریس چلا جاتا ہے۔

۴- مضمون صرف البرہان کو بھیجا گیا ہو۔ بعض احباب مضمون لکھ کر کئی جرائد و اخبارات کو بھجوا دیتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی تو طبع کر دے گا۔ البرہان ایسے مضامین قبول نہیں کرتا۔

۵- ادارہ ایک ہفتے کے اندر آپ کو بذریعہ ای میل یا SMS مضمون کے قابل اشاعت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں مطلع کر دے گا۔

۶- اگر ادارہ کسی وجہ سے مضمون قبول نہیں کرتا تو اس پر برا نہ منائیں اور اصرار نہ کریں۔ ہو سکتا ہے آپ کا مضمون اچھا ہو لیکن ادارہ کسی مجبوری کی وجہ سے اسے طبع نہ کر سکتا ہو۔ اس مجبوری کو جاننے پر اصرار جانبین کے لیے سبب کوفت ہوگا۔

۷- البرہان کا دائرہ ذوق و دلچسپی تعلیم و تربیت، مغربی فکر و تہذیب، منہج غلبۂ دین، تزکیۂ نفس وغیرہ تک محدود ہے۔ روٹین کے دینی، معلوماتی، اصلاحی، فقہی، سیاسی اور ادبی موضوعات کے لیے اس کے محدود صفحات میں زیادہ گنجائش نہیں نکلتی۔

تعلیم و تربیت **ایس ایم محمد ادریس** ☆

ہماری جامعات: سامراجی نقطۂ نظر کی پرورش گاہیں

میں کوئی عالم و فاضل نہیں بلکہ ایک کارکن ہوں جس نے اس دور میں پرورش پائی جب ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں نوآبادیاتی نظام کے ستائے ہوئے لوگ انصاف، آزادی، خودمختاری اور حریت کے لیے دلیرانہ جدوجہد کر رہے تھے۔

میں بھی اپنی نسل کے انہی سامراج مخالف لوگوں میں سے تھا، جن میں اس نظام کی مخالفت کے بیج اوائل عمری ہی میں بو دیے گئے تھے۔ یہاں میں ایک ذاتی تجربہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔

پینانگ میں ایک اینگلو چائنیز اسکول میں جو کہ ایک مشنری اسکول تھا، میں نے اپنی انگریزی کی استانی مس مورٹون کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور اسکول میں نیکر پہننے سے انکاری ہو گیا۔ میں اپنے اوپر اس قسم کی کوئی بھی پابندی عائد کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ مس مورٹون کی ناراضی کے باوجود میں لمبے پاجامے ہی پہنتا رہا تاکہ مسلمانوں کے طرزِ لباس سے وابستہ رہ سکوں۔ مزاحمت کا یہ جذبہ میرے اندر اور میری نسل کے سامراج مخالف لوگوں میں اب بھی زندہ ہے۔

جب سامراجی نظام کا جھنڈا 'یونین جیک' سرنگوں ہوا تو ہمیں اس بات کا یقین تھا اور ہم اس پر بہت خوش تھے کہ ہم نے خود کو صدیوں پرانے نوآبادیاتی نظام کے شکنجوں سے آزاد کرا لیا ہے اور اب ہم اپنی زبان، تہذیب، روایات اور نظامِ تعلیم پر فخر کرتے ہوئے دوسری اقوام میں سربلند اور ممتاز ہو سکتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ ہمارا یہ یقین سطحی اور غیر موزوں تھا، مجھ پر اس وقت آشکار ہوئی جب میں ۱۹۸۷ء میں کلاڈ آلویرز اور تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک (Third World Network) کے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ کلکتہ کے دورے پر تھا۔ ہم کھانا کھانے کے لیے ایک ریستوان میں گئے لیکن مجھے محض اس بناء پر داخل ہونے سے روک دیا گیا کہ میں سارونگ (ملایا کے قومی لباس) میں ملبوس تھا۔ یہ میرے لیے بہت مایوسی کی بات تھی کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مس مورٹون ابھی بھی آس پاس ہی موجود ہیں حتیٰ کہ مہاتما گاندھی کی سرزمین پر بھی۔

☆ چیف ایڈیٹر ماہنامہ 'تھرڈ ورلڈ ریسرجنس' ملائیشیا [عالمی کانفرنس سے اختتامی خطاب]

ہم اس بات کا ادراک کرنے سے قاصر رہے کہ نوآبادیاتی نظام نے ہمارے معاشروں میں گہری جڑی بنالی ہیں۔ اس نے نہ صرف ہماری سیاست و معیشت پر قابو پایا بلکہ یہ نوآبادیاتی نظام کے شکار لوگوں کے لیے اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ یہ ایک ایسی پرفریب قوت تھی جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں نفوذ کر گئی تاکہ ہمارے اوپر مکمل قابض ہو سکے۔

میرے ساتھیو! ہم میں سے یہاں موجود لوگوں میں سے کتنے اس روگ سے صحیح طریقے سے واقف ہیں جو ہمیں تکلیف دیتا ہے۔ اس کانفرنس میں جو کچھ بھی کہا اور کیا گیا ہے، اس کے برخلاف ہم میں سے کتنے لوگ بطور نمونہ اپنا قومی لباس زیب تن کرنا پسند کریں گے۔ ہم ایسا کرنے میں بہت شرمندگی محسوس کریں گے۔ ہمیں یہ بات خوفزدہ کیے دیتی ہے کہ یہ لباس قابل قبول نہیں ہوگا اور اس کی وجہ سے ہمیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یہ اس آزار کا خفیف سا درجہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ سنجیدہ صورت حال یہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جلد کو گورا کرنے، پلکوں کو بھاری بنانے اور بالوں کو بھورا کرانے کے چکروں میں ہیں تاکہ خود کو ایشیائی باشندوں کے بجائے کوہ قاف کے نقلی باشندوں میں تبدیل کر سکیں۔

جھوٹ کا جال

نوآبادکار، اپنی جارحیت کے زعم میں، دنیا بھر میں اپنے نوآبادیاتی کارناموں کے لیے کسی بھی قسم کی اخلاقی حدود و قیود سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ کا ایک جال بنتے ہیں کہ ان کے محکوم لوگ بچگانہ، غیر مہذب اور مضحکہ خیز مخلوق ہیں جنہیں تہذیب یافتہ بنانے کی ضرورت ہے۔ ایسے بدترین واقعات بھی موجود ہیں جہاں انہوں نے مقامی لوگوں سے انسانیت سوز سلوک کیا اور ان کے خلاف نسل کشی کے مرتکب ہوئے۔

لارڈ میکالے نے، جس نے ہندوستان کا نظام تعلیم ترتیب دیا تھا، انتہائی نخوت سے یہ اعلان کیا کہ تمام تاریخی معلومات، جو سنسکرت زبان میں لکھی گئی تمام کتابوں سے لی گئی ہیں، کی قدر و قیمت ان ادنیٰ خلاصوں سے بھی کم ہے جو انگلستان میں ابتدائی مدارس میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ایک سفید جھوٹ ہے، کیونکہ یورپ نے اس امر کا اعتراف کیے بغیر (جیسا کہ وہ احیاے علوم کی تحریک سے یہ ذکر حذف کر دیتے ہیں) عربوں، ہندوستانیوں، چینی لوگوں اور امریکہ کے سرخ ہندی باشندوں کے وسیع ذخائر علمی سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔

نوآبادیاتی نظام تعلیم ان جھوٹی باتوں کو فروغ دینے کا ذریعہ تھا۔ اس کا مقصد منتظمین، کلرکوں، پیشہ ور افراد اور علمی اکابرین کی ایک ایسی کھیپ تیار کرتا تھا جو نوآبادیاتی نظام کو قائم رکھ سکے اور اس کا دفاع بھی کر سکے۔ ان کی تعلیم نے ان کی تاریخی و تہذیبی جڑوں کو کاٹ ڈالا اور مغربی رسوم، اقدار اور تصورات سے

لاجوڑا، جوان کے اندر پیوست کر دی گئی تھیں۔

اس بنیادی سماجی جوڑ توڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے نوآبادیاتی ذہن رکھنے والی ادنیٰ تخیل کی حامل اور تخلیقی صلاحیت سے عاری مقامی اشرافیہ تیار کر دی۔ انہیں ایسی مسخ شدہ شخصیت بنا کر رکھ دیا جو خود اعتمادی، عزت نفس اور وقار سے عاری تھی۔ ان کا طرزِ زندگی، ذوق اور اقدار عام لوگوں سے کوسوں دور جب کہ اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کے خاصا قریب تھا۔ ان کے بارے میں جیسا کہ لارڈ میکالے نے کہا کہ یہ ان لوگوں کی جماعت تھی جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی، ملایئشیائی، چینی یا افریقی تھے لیکن اپنی پسند و ناپسند، اپنی آراء، اخلاقیات اور ذہنیت کے اعتبار سے انگریز تھے۔

نوآبادکاروں کے چلے جانے کے بعد، اقتدار اس طبقے کے ہاتھوں میں آ گیا۔ انہوں نے اداروں مثلاً سول سروس، عدلیہ، پولیس اور جامعات وغیرہ کا انتظام وانصرام سنبھال لیا۔ یہ طبقہ نوآبادیات ہی کی پیداوار تھا تاکہ وہ اس کے مفادات کا تحفظ کر سکے اور ان کے فلسفے اور نظریات کو نقصان پہنچائے بغیر اس پر عمل درآمد جاری رکھوا سکے۔

ہماری جامعات سامراجی تصورات کی پرورش گاہیں ہیں، وہ اپنے تعلیمی نمونوں کے ذریعے مغربی بالادستی کو دوام بخشتی ہیں جو کہ ہماری تہذیب، زبان، طرز زندگی، نظامِ تعلیم اور عظمت کے لیے تباہ کن ہے۔

حقیقی آزادی حاصل کرنے اور خود اپنی حقیقت سے روشناس ہونے کے لیے ہمیں خود کو اس مغربیت سے پاک کرنا ہوگا جو ہمارے اندر سرایت کر چکی ہے۔ جیسا کہ اشیس نندی اور دوسرے لوگوں نے اپنی کتاب The Blinded Eye: 500 years of Christopher Columbus میں لکھا ہے:

> 'اندرونی کولمبس، بیرونی کولمبس کی نسبت زیادہ بڑی رکاوٹ ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کی سائنس، اس کی معیشت، فطرت کی طرف اس کے رویے، جنس اور صحت کے متعلق اس کے نظریات، دوسروں کے متعلق اس کے نقطۂ نظر اور ان کی زبانوں نے ہمارے اندر گہری جڑیں بنالی ہیں۔ ان چیزوں کو جڑوں سے نکال پھینکنا یقیناً تکلیف دہ امر ہوگا لیکن ایسی کوئی مجبوری بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے اس بنیادی کام کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچایا جائے۔'

اپنے آپ کو اندرونی کولمبس سے نجات دلانے کے مشن پر عمل پیرا ہونے کے لیے 'سٹیزنز انٹرنیشنل' نے بعض دیگر اداروں کے ساتھ مل کر تدریس وتحقیق کے موضوع پر تین بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کی

ہیں۔ ہم نے نصاب کی ازسرِ نو تشکیل اور بالادستی کے مسائل پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ نظریاتی اور عملی اعتبار سے ہم ایسی علمی دنیا کا حصہ نہیں بننا چاہتے جہاں ہمارا کردار محض ثانوی اور نقالوں کا سا ہو۔

اس کانفرنس میں، جو کہ جامعات کو نوآبادیات سے پاک کرنے کے موضوع پر پہلی کانفرنس تھی، نصاب کو یورپی اثرات سے، خواہ وہ نظریاتی ہوں یا طریقہ کار سے متعلق، آزاد کرانے پر غور کیا گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم استعماریت کے خاتمے کی نشاندہی کے قابل اہلِ علم حضرات کو مدعو کریں گے تاکہ وہ نصاب کے متعلق اپنے غیر یورپی تصورات کے بارے میں تبادلہ خیال کر سکیں کہ یہ نصاب کیسے معلوم ہوتے ہیں، کیا یہ مستند ثابت ہوں گے اور کیا یہ سوشل سائنس کے تناظر میں ایسی بنیاد ثابت ہوں گے جو یورپی تصورات کے رنگ میں رنگی ہوئی نہ ہو۔

کیا ہم اس سمت میں مزید پیش قدمی کر سکتے ہیں اور ان سوشل سائنسز کو جو ہمارے لیے بے کار ہیں اور ہماری اقدار اور مذہبی روایات سے لگا نہیں کھاتیں، نصاب میں شامل یا خارج کرنے کی آزادی حاصل کر سکتے ہیں اور خود اپنے لیے نئی سوشل سائنسز ترتیب دے سکتے ہیں؟

آیئے، خود اپنے ساتھ دیانتدار ہو کر سوچیں، یا تو ہمیں اس عزم و ہمت کا مظاہرہ کرنا ہوگا کہ ہم سماجی اعتبار سے اپنے لیے فائدہ مند سائنس ایجاد کر سکیں، یا ہمیں سماجی سائنس کی اندھا دھند تقلید بند کرنا ہوگی۔ کچھ یہاں اور کچھ وہاں سے مستعار لے کر ایک ایسا ملغوبہ تیار ہوگا جو کسی کو بھی متاثر نہ کر سکے گا اور درحقیقت بے معنی ہوگا۔

ہم اپنے ورثے کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جو کہ خطرے میں ہے۔ ہم ان بیڑیوں کو جو کہ ہمیں باندھ کر غلام بنائے ہوئے ہیں، ہٹائے بغیر مکمل طور پر آزاد اور خود مختار نہیں ہو سکتے۔

اگر میکالے نے اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ترجمان تیار کیے تھے تو آپ میں سے آگاہی اور علم رکھنے والے تمام افراد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کنٹرول کا رخ بدلنے کے لیے قیادت کریں اور اس کام کو شروع کرنے کی اوّلین جگہ ہماری جامعات کے اندر ہے۔

حتیٰ کہ ہماری جامعات میں بھی ایسی تبدیلیاں لانے کی کوشش کو ایک انتہا پسندانہ مشق گردانا جائے گا۔ ہماری نفسیات میں مغرب کا اثر و نفوذ اس قدر زیادہ ہے کہ اس سے ہٹ کر سوچنا ایک ناقابلِ تخیل بات ہے، اس ڈر سے کہ ہم غربت اور پسماندگی کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ سوچنا تو ایسا ہے جیسے نوآبادیاتی نظام کے آنے سے پہلے کوئی تہذیب موجود ہی نہیں تھی۔

تبدیلی آ سکتی ہے، اگر آپ ذرائع ابلاغ پر نظر دوڑائیں۔ کئی عشروں تک ہر کوئی یہی شکایت کرتا تھا

کہ دنیا کے ذرائع ابلاغ پر چند ایک مغربی ایجنسیاں قابض ہیں۔ الجزیرہ نے اس قبضے کو کسی حد تک توڑ ڈالا اور سماجی واقعات کو دیکھنے کا ایک بالکل مختلف، زیادہ پرکشش اور زیادہ مبنی بر حقیقت انداز متعارف کروایا۔

بہارِ عرب (Arab Spring) کے غنچوں پر بھی نظر دوڑائیں۔ ایک طویل عرصے تک ہمارا خیال تھا کہ آمریت اور استبداد عرب دنیا کی مستقل حالت ہیں۔ ظلم کے شکنجے کو توڑ پھینکنے کی جرات دکھانے سے عربوں میں انقلاب آئے گا بالکل اسی طرح جیسا کہ ترکوں نے عسکری تسلط سے نجات کے لیے پیش قدمی کی تھی۔

بین الاقوامی اداروں، جیسا کہ اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی وثقافتی ادارے (UNESCO)، پر ایک مقدس فرض عائد ہوتا ہے جسے کوئی اور ادا نہیں کرسکتا۔ یہ فرض ہے تہذیبوں کی حفاظت، انسانیت کے وسیع تنوع کی حفاظت، اس کی زبانوں، اس کے روایتی علوم اور مہارتوں کی حفاظت کا۔ یونیسکو اس دوڑ میں شامل نہیں ہوسکتا کہ تہذیبوں کا ادغام ہو اور ان متنوع تہذیبوں کو کچل کر ایک ہی برتر بھاری بھرکم عالمگیر تہذیب کی حکمرانی ہو جو دوسری تہذیبوں کا احترام نہیں کرتی۔ یونیسکو کو اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ سماجی سائنس بھی اسی قدر متنوع رہے جتنی خود انسانیت ہے اور اس امر کو بھی کہ تہذیبیں اور ان کے علوم یقینی طور پر محفوظ اور سلامت رہیں (بشکریہ ’مغرب اور اسلام‘)۔

تنظیم اسلامی کا نعرۂ حق

۱۶ ستمبر ۲۰۱۴ء کو تنظیم اسلامی پاکستان نے ایک پریس ریلیز جاری کی ہے کہ ساری دینی سیاسی جماعتوں کو مل کر پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد شروع کرنی چاہیے۔ یہ بات سو فیصد صحیح ہے اور صرف یہی نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔ ہماری دینی سیاسی جماعتیں چونکہ بدقسمتی سے فقہی مسالک پر قائم ہوئی ہیں لہٰذا وہ تقسیم در تقسیم ہوتی ہوئی نحیف ونزار ہوچکی ہیں اور کسی ایک جماعت میں اتنی قوت نہیں کہ وہ اپنے بل بوتے پر جیت کر حکومت بنا سکے یا بطور پریشر گروپ حکومت کو مجبور کر کے اسلامی مطالبات منوا سکے۔ لہٰذا اس کا حل ایک ہی ہے کہ ساری دینی سیاسی جماعتیں مل کر نفاذِ شریعت کی تحریک چلائیں۔

تنظیم اسلامی کو چاہیے کہ وہ محض اس بیان پر اکتفا نہ کرے بلکہ ساری دینی سیاسی جماعتوں اور اسلامی دانشوروں کا فوراً اجلاس بلائے اور پہلے پلاننگ کی جائے کہ مذکورہ تحریک کس طرح چلائی جائے گی اور پھر عملی اقدامات شروع کر دیئے جائیں۔ واللہ المستعان.

تعلیم و تربیت چوہدری رفاقت علی

علم الاسماء (آخری قسط)

چنانچہ مولانا رومی فرماتے ہیں:

عطار روح بود و سنائی دو چشمِ او
ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

ترجمہ: (عطار روح ہیں اور سنائی ان کی دو آنکھیں ہیں۔ میں سنائی و عطار کے نقشِ قدم پر چلنے والا ہوں)

اقبالؒ نے ان تینوں بزرگوں کی تصانیف سے استفادہ کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جا بجا تصوف کا رنگ جھلکتا ہے اور بالِ جبریل میں تو یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔

تیسرے شعر میں اقبالؒ نے بلاغتِ کلام کا اعجاز دکھایا ہے۔ کہتے ہیں کہ قوتِ فکر کا ثمرہ یہ ہے کہ انسان، زمان اور مکان کی ماہیت دریافت کرتا ہے...... یعنی اہم فلسفیانہ مسائل پر غور کرتا ہے اور قوتِ ذکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی پاکی بیان کرتا ہے۔

'سبحان ربی الاعلی' یعنی جب مسلمان سجدہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا رب تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہے اور سب سے اونچا ہے۔

الخضر ذکر اور فکر انسان کی دو بنیادی قوتوں کا نام ہے۔ جب وہ ذکر میں ترقی کرتا ہے تو رومی اور عطار کی صف میں جگہ پاتا ہے اور وہ فکر میں ترقی کرتا ہے تو فارابی اور بوعلی سینا کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے اور اسلام ایسا دین ہے جو ان دونوں قوتوں کا مجموعہ ہے۔

قرآنِ حکیم انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ مغربی تہذیب جسم کی عریانی کی طرف مائل کرتی ہے اور تہذیب اسلامی روح کی عریانی کی طرف۔

بقول علامہ اقبال: 'علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب'

اس میں علم کی حقیقت اور عشق کی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ علم کی رسائی عقل تک اور عشق کی رسائی روح تک ہے۔

آج ایک بار پھر ہمیں ان دونوں کو بروئے کار لانا ہے اور ایسا نظامِ تعلیم وضع کرنا ہے جو ہمیں علم بھی بھی دے (جس سے عقل کام آئے) اور 'روح' کی بالیدگی بھی جو صرف اور صرف اسلام (یعنی قرآن و سنۃ) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے 'علم الاسماء' اور 'علم وحی' دونوں علوم کا بیک وقت حصول دنیا کی زندگی......اور آخرت کی زندگی کی ابدی فوز وفلاح کے لیے از بس ضروری ہے۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فیصلہ صرف اور صرف آپ نے خود کرنا ہے کہ اگر دنیا مقصود ہے تو دنیا والوں کی تقلید کرو اور ان کے طریقوں کو اختیار کرو۔ اگر عقبی مطلوب ہے تو نمازوں کے بعد جنت کی دعائیں مانگو لیکن عقل مند وہ ہے جو دنیا اور عقبیٰ دونوں کے خالق اور مالک کو کسی طرح راضی کر لے یا اپنا بنا لے تو ساری کائنات خود بخود قبضہ میں آ جائے گا۔ اسے راضی کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس کی قضا سے راضی ہو جائے، جسے اصطلاح میں، شیوہ تسلیم و رضا کہتے ہیں، پھر وہ راضی ہو جائے گا۔ اسی لیے اقبالؒ کہتے ہیں کہ اگر کائنات پر حکومت کرنا چاہتے ہو تو دنیا اور عقبیٰ دونوں سے بلند تر ہو جاؤ۔ اصل بادشاہت یہ ہے کہ ان دونوں سے بے نیاز ہو کر اللہ کو مقصودِ حیات بنا لو۔

بقول اکبرالہ آبادی: تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے
سب مل گیا اسے، جسے اللہ مل گیا

اقبالؒ کا ایک مصرع ہے: دنیا ہے تزویراتی......اور عقبیٰ ہے مناجاتی!

بقول اکبرالہ آبادی:

نہ کتابوں سے، نہ کالج سے، نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

بقول اقبالؒ

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے؟
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

اس میں دنیا و آخرت دونوں کے لیے جدوجہد کا درس ملتا ہے گویا 'علم لاسماء' اور 'علم وحی' دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلیں گے تو ایک وقت آئے گا کہ امۃ مسلم رضائے الٰہی کے حصول میں کامیاب و کامران ہوگی اور 'حق نیابت' ادا کرنے کے اہل ہوگی۔ 'یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ' کے مصداق نظام علی خان نے انگریزوں کی حمایت کر کے ابدی لعنت خریدی اور سلطان ٹیپو شہیدؒ نے اسی اصول پر عمل

کر کے حیات جاوداں حاصل کر لی۔ تہذیب مغرب کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ خدا پرستی کی جگہ بُت پرستی کو فروغ ہو رہا ہے۔

بقول اقبالؒ ؎

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
جو ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

یہاں بھی 'دورِ حاضر' سے اقبالؒ کی مراد 'الحاد' اور 'بے دینی' ہے جس کا موجودہ دَور میں دَور دورہ ہے۔

یہ ناپاکی ترے حق میں حجاب بن گئی ہے...... ہر واقعہ کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے؟ ذرا سوچیے؟ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہمیں کہاں ہونا چاہیے تھا؟ ہم نے 'دین' کی رسی کو مضبوطی سے نہیں پکڑا بلکہ 'دین کی رسّی' کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے...... نتیجہ صاف ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت کو نہیں بدلتا نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا...... معجزہ تو ہو گا نہیں جہدِ مسلسل کو اپنانا ہو گا۔ دنیوی اور دینی علوم میں کمال حاصل کرنا ہو گا۔ اسی کی تلقین اسلام میں کی گئی ہے۔ علم الاسماء میں تو اللہ رب العزت نے یہی واضح فرمایا ہے کہ دنیا کی کامیابی کا دارومدار بھی اسی بات پر ہو گا۔ جو 'علم' اللہ تعالیٰ نے آدم کو...... فرشتوں کے سوال و جواب کرنے سے پہلے ودیعت کر دیا تھا اس کو uncover اور discover یعنی اس کو ظاہر کرنے اور دریافت کرنے کے لیے تحقیق و جستجو اور تفکر و تدبر سے کام لینا ہو گا۔ اسی کائنات میں رہتے ہوئے اللہ کے چھپے ہوئے اسرار تک رسائی حاصل کرنا ہو گی تا کہ پوری دنیا پر لا الہ الا اللہ کی حاکمیت ہو، بصورتِ دیگر بقول اقبالؒ ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کرتی نہیں لیکن ملت کے گناہوں کو معاف

مجموعی طور پر ہمیں ملت کو اٹھانا اور جگانا ہو گا تا کہ وہ کام جو محمد عربیؐ نے اقرأ سے شروع کیا تھا اور اس کی تکمیل مدینہ کی ریاست کی شکل میں کی تھی اس بڑی منزل یا بڑے (goal) کو حاصل کرنا ہے۔ اس کے لیے یونیورسل ایجوکیشن پروگرام مرتب کرنا ہو گا کیونکہ دین اسلام تو ہے ہی ساری انسانیت کے لیے۔ اس منزل کی سب سے پہلی سیڑھی بقول اقبالؒ یہ ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے...... مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ (جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کر لی...... اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی)

اس کے لیے مطالعہ بنی (اپنی ذات کی) (Introspection)؛ مراقبہ (Meditation)؛ گیان دھیان (Contemplation)؛ معرفت حاصل کرنا (Self knowledge)؛ ان تمام باتوں کا اہتمام کرنا ہوگا تا کہ (Self actualization) ہو اور ترقی کی راہیں (دنیا و آخرت میں) کھلیں۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔ وَ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (سورہ العنکبوت: ٦٩) (اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم انہیں ضرور بر ضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔’

اقبالؒ کہتے ہیں: تو ابھی تک آدمیت کے مقام پر نہیں پہنچا یعنی تجھے یہ معلوم نہیں کہ انسان کس قدر ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ مومن کے اندر جلال (یعنی شان و شوکت، قوت، حکومت، سروری) اور جمال (یعنی لطف و کرم، رحمت، نوازش، مہربانی) دونوں کا عکس پایا جانا ضروری ہے اور کلمۂ توحید ان دونوں (جلال و جمال) کا جامع ہے۔’

بقول اقبالؒ آج کل تو ہمارا یہ حال ہے کہ عبادات کے حوالے سے تیری نمازیں بالکل جسدِ بے روح کی طرح ہیں نہ ان میں جلال کا رنگ ہے اور نہ جمال کا اور نہ تیری اذان میں وہ تاثیر ہے کہ مسلمانوں کے مصائب کی تاریک رات ختم ہو اور وہ سحر نمودار ہو جس کا میں آرزومند ہوں۔

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو

تیری نِگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تیری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال

تری اذاں میں نہیں مری سحر کا پیام

یہ تمام اشعار ملت مسلم کو جگانے کے لیے ہیں اور اسے جدوجہد کرنے کی دعوت دے رہے ہیں کیونکہ ایک حدیث نبویؐ ہماری توجہ اس طرف مبذول کراتی ہے کہ

كَادَالْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا (قریب ہے کہ مفلسی انسان کو کافر بنا دے یعنی مفلسی انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے)۔ اسی لیے تو ’علم الاسماء‘ کا سہارا لینا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے امر کی تعمیل میں سائنس اور

ٹیکنالوجی اور دیگر عصری علوم جن کا تعلق انسانیات سے ہے، ان میں کمال حاصل کرنا ہوگا۔ تمام عصری علوم ...... فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، نفسیات، جغرافیہ، فلکیات، معاشرتی علوم وغیرہ کو اہمیت دینا ہوگا۔ اس 'علم الاسما' سے حاصل کی گئی نئی ایجادات، نئی دریافتیں، نئے فارمولے اور انسانی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف علوم (سوشیالوجی وغیرہ) کو عمل میں لانا ہوگا۔

ایک بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کے احکامات انسانی نفسیات کے مطابق ہی نازل کیے ہیں اب ہمیں قرآن حکیم کے ان احکامات کو انسانی نفسیات کے ساتھ مرتبط کرنا ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن حکیم کا کوئی بھی حکم انسانی نفسیات کے ساتھ متصادم نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ کیونکہ اسلام دین فطرت ہے۔ اب ہمارا کام ان فطری اصولوں کا ارتباط انسانی نفسیات کے ساتھ کرنا ہے تاکہ پوری انسانیت اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکے...... پھر ان شاء اللہ تعالیٰ بوعلی سینا بھی پیدا ہوگا اور الفارابی بھی۔

بوعلی سینا دسویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام کا نامور حکیم اور فلسفی گزرا ہے۔ منطق، فلسفہ اور طب میں ید طولی رکھتا تھا۔ اس نے ارسطو کے فلسفے کی شرح لکھی ہے اور اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں: اشارات اور شفاء۔ محقق طوسی نے 'اشارات' کی شرح لکھی ہے یہ کتاب عام طور پر ہمارے عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔

تلخیص

- حضرت آدم علیہ السلام کو 'علم الاسماء' فرشتوں سے سوال وجواب کرنے سے پہلے ودیعت کیا گیا۔
- 'علم الاسماء' جنت میں ہی عطا کیا گیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے 'وحی' کا نزول زمین پر حضرت آدم علیہ السلام کے آنے کے بعد ہوا۔
- حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی کہ دنیا میں زندگی گزارنے اور اس کی سہولیات حاصل کرنے کے لیے 'علم الاسماء' کا استعمال کرنا ہوگا لیکن اس علم کے ذریعے سے حاصل شدہ سہولیات کو 'علم وحی' کے تحت استعمال کرنا ہوگا۔ مثلاً روزی تو کمائے گا 'علم الاسماء' کے ذریعے لیکن اس کا استعمال ہوگا 'علم وحی' کے تحت (یعنی حلال وحرام کی پہچان کرنا ہوگی اور 'وحی' کے ذریعے احکامات کو پیش نظر رکھنا ہوگا)۔
- حضرت آدمؑ کا زمین پر اتارا جانا اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی۔

- اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنا خلیفہ بنایا۔

- خلیفہ کا کام...... فساد فی الارض کو مٹانا ہے...... کیونکہ آدمؑ سے پہلے جنّ اس زمین پر آباد تھے جنہوں نے فساد برپا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے جنّوں کو وادیوں اور سمندروں میں دھکیل دیا۔

- حضرت آدمؑ اور اولادِ آدم کا اصل مقام جنت ہی ہے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو راضی کر کے واپس جنت میں جانا ہوگا۔

- حق خلافت یا حقِ نیابت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انتخاب کیا تو حضرت آدمؑ کا اور ان میں تمام صلاحیتیں اور استعدادیں ودیعت کر دیں تا کہ حضرت آدمؑ اور اولا دآدم اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ، اس فریضہ کو بخوبی انجام دے کر دوبارہ اپنے مقام (جنت) میں پہنچ کر ابدی زندگی کی راحتیں اور سکون حاصل کرے۔

- فرشتوں کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے انبیاءؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین کی تصاویر کو بطورِ شہادت، فرشتوں کے سامنے کیا گیا۔

- اپنی زندگی گزارنے کے لیے روزی کمانے کے طریقے، اپنی حفاظت کے مختلف ہتھیار تیار کرنا 'علم الاسماء' کو کام میں لاتے ہوئے۔

- اپنی گھریلو زندگی (زمینی زندگی) کو آسان اور پُر آسائش بنانے کے لیے مختلف ایجادات، اس علم الاسماء کی مرہون منت ہیں۔

- حضرت آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام، خواص، مفردات، مرکبات القاء کیے گئے جو اولادِ آدم کو منتقل ہوئے۔ مثلاً حضرت داؤدؑ کو زرّہ بنانے کا طریقہ ان کے دل میں القاء کیا گیا۔ علی ھذا القیاس تمام ایجادات، دریافتیں، فارمولے (فزکس، کیمسٹری، ریاضی، بیالوجی) اور نفسیات، سوشیالوجی وغیرہ کا علم حضرت آدمؑ کو ودیعت کیا گیا...... اولادِ آدم نے مختلف تجربات کر کے مفردات، مرکبات کے ذریعے پانی سے بجلی، لوہے سے ٹینک، ہوائی جہاز، ریل گاڑی (ریلوے انجمن) بنائے۔ انسان کی سہولت کے لیے۔

- یہ 'علم الاسماء' حضرت آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو عطا کیا گیا...... اس میں مومن و کافر کی کوئی شرط نہیں کیونکہ سب ہی اولادِ آدم ہیں۔ جو ان علوم پر محنت کر کے مختلف تجربات سے گزرے گا وہی ترقی حاصل کرے گا اور پوری دنیا کے انسانوں پر برتری اور حکمرانی کرے گا۔

- مومن کے لیے اس علم کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ کر ہے جس کے ذمہ خلافتِ ارضی کا فریضہ ہے۔ اگر نہیں کرے گا تو اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا۔

- قوتِ شہویہ، قوتِ غضبیہ کے بغیر قوتِ عقلیہ اور ادراکیہ پیدا نہیں ہوسکتی...... فرشتوں کو اسی کا ذہول ہوا۔ جب ان تینوں قوتوں کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفات سے متصف ہوکر انسان اللہ تعالیٰ کا وہ قرب حاصل کرتا ہے جس پر فرشتے بھی عش عش کیے بغیر نہ رہ سکے۔

- یہی 'علم الاسماء' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیش کیا تو وہ نہ صرف حضرت آدمؑ اور اُس کی ذرّیت کے قائل ہوئے بلکہ عش عش کرنے لگے۔ آج اسی 'علم الاشیاء' کی تشریح آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے...... تاکہ حقِ خلافت اور حق نیابت کا فریضہ انجام دیا جاسکے۔ یاد رہے اس علم کو 'علم وحی' کے تحت عمل میں لانا ہے۔ رہی یہ بات کہ فرشتوں کو یہ علم کیوں نہیں دیا گیا اور انہیں زمین کی خلافت کیوں نہیں سونپی گئی تو اس حکمت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے فرمایا: اِنِّی اَعْلَمُ مَالَاتَعْلَمُوْنَ (بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کا علم جزوی ہے اور وہ مقرب ہونے کے باوجود علم غیب نہیں رکھتے۔ غیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سورہ نمل: ۶۵ 'کہہ دو کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کے سوا، غیب کی باتیں نہیں جانتے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ کب زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے (یعنی فرشتے اور جن اور آدمی ان سب میں سے کسی کو غیب کی خبر نہیں یعنی کسی کو خبر نہیں قیامت کب ہوگی)

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا 'جو شخص تمہیں کہے کہ نبیؐ غیب جانتے تھے تو بلاشبہ اس نے جھوٹ کہا، اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا' (بخاری، کتاب التوحید)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو چھوٹی بڑی تمام اشیاء کے سب نام سکھا دیئے اور خلافت کا منصب (جو حضرت آدمؑ کو سونپا جارہا تھا) کا تقاضا بھی یہی تھا کہ انہیں تمام چیزوں (یعنی علم الاسماء) کا علم عطا فرمایا جاتا...... کیونکہ خلافتِ ارضی کا قیام علم الاسماء کے بغیر ممکن نہ تھا...... اسی لیے 'علم الاسماء' کا جاننے کے بعد اس پر عمل کرنا گویا تحقیق و جستجو، تجربات، مفردات اور مرکبات کی پہچان ازبس ضروری ٹھہرائی گئی جب ہی 'حق نیابت' یا حق خلد ارضی' ادا کرنا ممکن ہے۔ اس میں کوتاہی گویا اپنے فرائض منصبی میں کوتاہی کے مترادف ہے اور مسلمانوں کو دوسروں سے کہیں بڑھ کر اس ذمہ داری کو ادا کرنے کا حکم ہے اور اسے وحی الٰہی کے تابع استعمال کرتے ہوئے پوری انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لانے کی سعی و کوشش کرنا ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ **اللھم انصر من نصر دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وجعلنا منھم، واخذل من خذل دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ولا تجعلنا منھم. آمین! یا رب العالمین.**

عالم اسلام ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

احمق یا غدار ☆

۱۹۸۴ء میں کینیڈا کی ایک خاتون نے جو اکنامکس اور پولیٹیکل سائنس کی پروفیسر تھی، سعودی عرب میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ وہ ۱۹۸۱ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک وہاں رہی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک صحافی کی بیوی کے طور پر وہاں متعارف کرایا اور یہ ظاہر کیا کہ اس کو عربوں اور مسلمانوں کی معاشرت، رہن سہن، ثقافت اور خاندانی معاملات سے دل چسپی ہے۔ یوں اس کو وہ سہولتیں حاصل ہوگئیں جو عام مغربی لوگوں کو سعودی عرب میں حاصل نہیں ہوتیں اور اس نے بااثر سعودیوں کے گھروں میں آنا جانا شروع کر دیا اور بہت سی معلومات سعودیوں کے بارے میں جمع کیں۔

ان معلومات کی بنیاد پر اس نے ۱۹۸۴ء میں ایک کتاب لکھی 'The Saudis' یعنی سعودی لوگ اور معاشرہ، جو بہت معروف ہوئی اور اس زمانے کی مقبول ترین کتابوں میں سے تھی۔ ۱۹۸۶ء-۱۹۸۹ء کے سالوں میں اس کے بیسیوں ایڈیشن نکلے اور لاکھوں نسخے دنیا بھر میں پڑھے گئے۔ اس کتاب کا ایک باب سعودی عرب کی معاشیات اور آمدنی کے بارے میں تھا۔ اس باب کا ایک اہم بیان میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ جس کے بعد مَیں اپنی گفتگو آگے بڑھاؤں گا۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ سعودی عرب کی کل اور مجموعی آمدنی کتنی ہے، اس کا سعودیوں میں سے بھی کسی کو اندازہ نہیں۔ کسی کو بھی حتمی اور قطعی طور پر یہ معلوم نہیں کہ ان کے ملک کی آمدنی دراصل کتنی ہے۔ باہر کی دنیا میں بھی کسی کو نہیں معلوم، اور ان کو بھی نہیں معلوم۔ بڑی انٹیلی جنس ایجنسیز کو مثلاً سی آئی اے وغیرہ کو علم ہو تو ہو۔ عام لوگوں کو علم نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کر لیں کہ اس خاتون کے بیان کے مطابق سعودی عرب کی کل آمدنی کا پندرہ فیصد حصہ شاہی خاندان کو بطور رائلٹی کے دیا جاتا ہے یعنی ملک کی مجموعی آمدنی کا پندرہ فیصد۔ شاہی خاندان سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو شاہ عبدالعزیز کے دادا کی اولاد میں سے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کے دادا کا نام ترکی تھا۔ ان کی اولاد میں، جن میں شاہ عبدالعزیز کے چچا اور چچاؤں کی اولاد اور دادا اور ان کے بھائی کی اولادیں بھی شامل ہیں۔ ان سب کی تعداد اُس وقت (یعنی ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں) ساڑھے تین ہزار تھی۔ اور اصول یہ تھا کہ سب سے زیادہ رائلٹی خود بادشاہ کو ملے گی۔ اس وقت شاہ خالد بادشاہ تھے، پھر بادشاہ کے بھائیوں کو ملے گی۔ سگے بھائیوں کو سب سے زیادہ اور پھر بادشاہ کے ماں جائے بھائیوں کو ملے گی۔ جو مختلف ماؤں

☆ ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم کی کتاب 'اسلامی بینکاری - ایک تعارف' مرتبہ عزیز الرحمٰن ص ۱۲۹ تا ۱۳۳ - عنوان البتہ ہمارا ہے۔

کی اولاد ہیں۔ پھر بادشاہ کے سگے بھتیجوں کو ملے گی۔ پھر ہوتے ہوتے نسبتاً دور کے بھائیوں کو ملے گی۔ بالآخر ہوتے ہوتے ان کی باری آئے گی جو عبدالعزیز کے دادا کی دوسری اولاد میں سے ہیں۔ یہ کل تعداد ساڑھے تین ہزار تھی۔ ان ساڑھے تین ہزار میں جس کو سب سے کم رائلٹی ملتی تھی وہ دس لاکھ ڈالرز روزانہ ملتی تھی۔ اب آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ ملک کی مجموعی دولت کتنی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ سعودیوں کے پاس یہ ساری دولت خرچ کرنے کے ذرائع نہیں تھے۔ انہوں نے جتنا بھی خرچ کیا یہ دولت کم نہ ہوئی، بڑھتی ہی چلی گئی۔ بعض ناقدین کے قول کے مطابق دولت کو انہوں نے نالیوں میں بہایا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ دولت کو بلا مبالغہ انہوں نے ہر طرح لٹایا۔ لیکن نالیوں میں لٹانے کے باوجود وہ ختم نہیں ہوتی تھی۔

یہ ساری کی ساری دولت امریکہ کے بینکوں میں جمع تھی۔ سالہا سال سے جب سے تیل نکلنا شروع ہوا تھا، اس وقت سے ان کی دولت امریکہ کے بینکوں میں جمع ہوتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی مالیت جو کھربوں ڈالرز سے بھی بڑھ کر تھی امریکہ کے مختلف بینکوں میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا سود ہی اتنا تھا کہ بعض ماہرین کہتے تھے کہ بہت جلد ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ سعودی عرب کا سارا نظام اس تیل کی دولت کے سود سے ہی چلے گا۔ ۱۹۸۲ء میں امریکی حکومتی نے ایک قانون بنایا۔ اس قانون میں یہ لکھا تھا کہ اگر کسی غیر امریکی کی کوئی دولت امریکہ کے کسی بینک میں جمع ہو اور اتنے ڈالرز سے زائد ہو (معمولی رقم تھی، شاید دس ملین، یا اس سے کچھ زیادہ) اور وہ سال میں دو فیصد سے زیادہ اس میں سے نکالنا چاہے تو اسے اسی وقت منجمد کر دیا جائے گا اور رقم نکالنے والے کو مزید رقم نکالنے سے روک دیا جائے گا۔

مجھے یہ پڑھ کر فوراً ایک دھچکا سا لگا کہ یہ تو میرے مسلمان بھائیوں کی دولت کو کھا جانے کا اور لوٹنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ میں نے اس قانون کا متن بہت تگ و دو کر کے حاصل کیا، اس کا عربی ترجمہ کیا اور ایک یادداشت اس موضوع پر لکھی۔ اس میں ان حضرات سے یہ گزارش کی (ان حضرات سے جن کے ملکوں کی دولت وہاں جمع ہے) کہ آپ کی جتنی بھی دولت اس وقت وہاں جمع ہے اس کا دو فیصد سے زیادہ تو آپ کبھی بھی نہیں نکال سکتے۔ اگر نکالیں گے تو آپ کی ساری دولت ضائع ہو جائے گی۔ کم از کم آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ آئندہ آپ اپنی دولت وہاں جمع نہ کرائیں اور جو جمع ہے اس کو کم از کم ڈیڑھ پونے دو فیصد سالانہ کے حساب سے نکالتے رہیں۔ اس طرح ۶۰، ۶۵ سال کے عرصے میں امید ہے کہ آپ اپنی دولت واپس لے سکیں گے۔ یہ سب کچھ میں نے بڑی محنت سے لکھا، اس زمانے میں نہ کمپیوٹر ہوتے تھے، نہ فوٹو اسٹیٹ مشینیں آسانی سے دست یاب ہوتی تھیں۔ بہت بھاگ دوڑ کر کے بڑی محنت سے اس یادداشت کو بہت خوب صورت ٹائپ کرایا۔ اور پھر چھ سات ملکوں کے سفارت خانوں کو اور ان کے ذریعے وہاں کے حکمرانوں کو بھیجا۔ کسی ایک نے

بھی جواب نہ دیا۔ کہیں سے یہ رسید بھی نہیں آئی کہ تمہارا خط مل گیا۔ کسی کے سیکرٹری یا چپراسی کی طرف سے بھی یہ اشارہ نہ ملا کہ آپ کا خط مل گیا ہے شکریہ۔ اس مثال سے آپ اندازہ کرلیں کہ ہمارے بھائیوں کی کتنی دولت وہاں جمع ہے اور مغربی بینکوں کا نظام کیسے چل رہا ہے اور اس بارے میں ان ممالک کے حکمرانوں کے سوچنے کا انداز کیا ہے؟ اور امت مسلمہ کے مستقبل سے ان کی کس قدر ذہنی وفکری وابستگی ہے؟

پھر جب صدام حسین نے کویت پر قبضہ کیا۔ میں س کی تفصیل میں نہیں جاتا کہ باخبر لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ لیکن جوں ہی یہ واقعہ پیش آیا فوراً امریکہ کی فوج سعودی عرب میں آکر اتر گئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے دفاع کے لیے اور کویت کو آزاد کرانے کے لیے آئے ہیں۔ ہماری افواج کے اس آنے کے اور جنگ کے سارے اخراجات آپ کے ذمے ہوں گے۔ پھر جن جن ملکوں سے ہم سلامتی کونسل میں عراق کے خلاف جنگ میں تائید حاصل کریں گے ان ملکوں نے ہم سے تائید فراہم کرنے کے عوض نقد رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ چین نے بقول ان کے ایک ارب ڈالر کا مطالبہ کیا تھا۔ ایک ارب ڈالر کا مطالبہ کسی اور نے کیا تھا۔ یہ دونوں ممالک سلامتی کونسل کے ممبران تھے، یوں دو تین ارب ڈالر تو انہوں نے صرف رشوت کے نام سے (میں تو رشوت ہی کہوں گا، آپ کا دل چاہے تو معاوضہ کہیں، یا تالیف قلب کہیں، جو بھی کہیں) یہ رقم انہوں نے تین ممبر ممالک کو اس لیے ادا کی کہ وہ امریکہ اور کویت کے حق میں ووٹ دیں اور عراق کے خلاف امریکی اقدام کی تائید کے لیے ووٹ دیں۔ یہ تین ارب ڈالر دے کر کویت اور سعودی عرب نے گویا اقوامِ متحدہ سے امریکی حملہ کا جواز منوایا تھا۔ اس کے بعد امریکہ نے اگر ایک میزائل چلایا تو کویت اور سعودی عرب کو دس میزائلوں کا بل پیش کیا۔ اگر امریکا کا ایک سپاہی آیا تھا تو اس کی تعداد کئی گنا بتائی گئی، اس کی وہ تنخواہ رکھی گئی جو سعودی عرب میں شاید یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہی کی ہوتی ہوگی۔ یہ رقم ان کے سپاہیوں کی وہ تنخواہ تھی جو ان کو سعودی خزانے سے کویت کے خزانے سے سال ہا سال دی گئی۔ جنگ کے جو اخراجات بتائے گئے تھے ان کا بل اتنا تھا کہ کسی کو آسانی سے یقین نہیں آئے گا۔ لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ ۱۹۹۰ء سے لے کر بعد کے کئی سالوں تک کویت اور سعودی عرب سے جو تیل امریکہ کو جاتا تھا وہ مفت جاتا تھا، بالکل بلا معاوضہ، اس لیے کہ ابھی تک وہ اخراجات پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس تیل کے لے جانے کا خرچہ بھی سعودی عرب اور کویت ادا کرتے رہے۔ تیل بھی مفت جاتا رہا اور جانے کا خرچہ بھی یہ دونوں ممالک دیتے رہے اور ابھی تک ان کا یہ بل پورا ادا ہوا یا نہیں ہوا، یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اتحاد امت **پروفیسر طارق بٹ**

ہماری دینی جماعتیں اور ادارے: کچھ تو خدا کا خوف کریں اور لوگوں کو مزید مایوس نہ کریں☆

ایک عام پاکستانی کی طرح ہم بھی علماء کرام کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن آج درد کچھ میرے دل میں سوا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم حلفاً کہتے ہیں کہ سچ کہیں گے اور سچ کے سوا کچھ نہ کہیں گے اور نرم الفاظ میں کہنے کی کوشش کریں گے۔

ہماری دینی جماعتیں پہلے شیعہ سنی، دیوبندی بریلوی، مقلد غیر مقلد، وہابی اور بدعتی وغیرہ کی بنیاد پر لڑا کرتی تھیں (ان بچاروں کو آج تک سمجھ نہیں آئی کہ انہیں لڑانے والا کون ہے؟) لیکن اب ان کا لڑنے کا یہ چسکا اتنا بڑھ چکا ہے کہ ہر جماعت نے اپنے اندر کئی دھڑے بنا لیے ہیں جو آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ گویا یہ جماعتیں اب اس طرح کی لڑائی میں خود کفیل ہو گئی ہیں۔ تاریخی ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر ہم اس کی کچھ تفصیل یہاں عرض کیے دیتے ہیں:

جمعیت علماء پاکستان

اس نام سے حنفی بریلوی مسلک کے لوگوں کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی جو سوادِ اعظم کے سیاسی مفادات کے تحفظ کی آڑ میں ایجنسیوں نے وہابیوں (جماعت اسلامی، دیوبندی، اہل حدیث) کے خلاف لڑنے کے لیے قائم کرائی تھی۔ کبھی اس جماعت کا بڑا دبدبہ تھا اور اسمبلیوں میں نشستیں بھی ہوتی تھیں۔ اب یہ اتنے دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے کہ ان دھڑوں اور ان کے سربراہوں کے نام یاد رکھنے بھی مشکل ہیں۔ یہ کبھی کبھی آپس میں اتحاد قائم کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن باہم لڑنے کی عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ پھر لڑ پڑتے ہیں۔

اہل حدیث حضرات

حنفی سواد اعظم کے اس ملک میں اہل حدیث جتنے کم ہیں، اتنی ہی زیادہ انہوں نے جماعتیں بنا رکھی ہیں۔ جماعۃ الدعوۃ کے علاوہ پروفیسر (؟) ساجد میر صاحب کی مرکزی جمعیت اہل حدیث، ابتسام الٰہی ظہیر

☆ ادارے کو مصنف کی ساری باتوں سے اتفاق نہیں ہے تاہم انتشار و افتراق کی مذمت اور اتفاق و اتحاد کی تلقین کی وجہ سے ہم نے اس کی طباعت گوارا کی ہے۔ مدیر

صاحب اور حافظ عبدالغفار روپڑی صاحب کی جماعتیں اور دوسری بہت سی جمعیتیں، جن میں سے اکثر تانگہ پارٹی ہیں اور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔ ساجد میر صاحب البتہ اتنے سیانے ضرور ہیں کہ ن لیگ کا دم چھلا بنے رہتے ہیں جس کے طفیل ایک آدھ نشست ان کو مل جاتی ہے اور یوں سیاسی تقریریں کرنے اور بیان دینے کا چسکا پورا کرنے میں ان کو یک گونہ تفوق اپنے حریفوں پر حاصل رہتا ہے۔ کہاں کا نفاذ شریعت اور کہاں کا غلبۂ دین؟

اہل تشیع

سنیوں کے اکثریتی ملک میں ان کی تعداد بہت کم ہے اس کے باوجود انہوں نے اپنے اتحاد اور قوت سے کمزور حکومتوں سے اپنے وزن سے بڑھ کر مسلکی مطالبات منوائے ہیں لیکن باہمی خلفشار میں یہ بھی دوسروں سے پیچھے نہیں ہیں اور ان کے اندر بھی کئی گروپ اور جماعتیں ہیں جن میں ساجد نقوی صاحب کی تحریک اسلامی اور جماعت وحدت المسلمین نمایاں ہیں۔ فرقہ وارانہ دہشت گردی میں ان کے کردار کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

جمعیت علماء اسلام

اس بھاری بھر جمعیت کے تین دھڑے ہیں، جمعیت علماء اسلام (ف) کے علاوہ مولانا سمیع الحق صاحب کی (س) اور نظریاتی کی (ن) مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو سیاست چونکہ ورثے میں ملی ہے لہٰذا جب تک وہ زندہ ہیں اس کی صدارت کیوں چھوڑیں؟ ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ یہ میڈیا والوں کی زیادتی اور بدنیتی ہے کہ مولانا نے اگر بھول کر ایک دفعہ ڈیزل کے پرمٹ خرید لیے تھے تو یہ انہوں نے مولانا کی چڑ بنالی ہے ورنہ دوسرے سیاستدان سرے محل اور رائے ونڈ محل اور پتہ نہیں کیا کیا منرل واٹر میں گھول کر پی جاتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے تو مولانا کو ایک پرمٹ کے لیے بدنام کرنا کہاں کا انصاف ہے؟

مولانا کی دوسری خوبی ہے تحمل اور شگفتہ مزاجی- نفاذِ شریعت اور غلبۂ دین جیسی ثقیل اصطلاحات اور کاموں کے پیچھے وہ کبھی نہیں پڑے اور نہ انہوں نے درس نظامی میں اتنی گاڑھی عربی پڑھی تھی۔ دینی مدارس کے تحفظ کا نعرہ لگائے رکھنا اور ہزاروں مدارس کو اپنی پشت پر شو کرنا کوئی کم گراں بار ذمہ داری نہیں! بلکہ یہ بھی ان کی خوبی ہے کہ جتنا ان کا سیاسی قد کاٹھ ہے وہ اس کا پورا وزن ہر حکومت پر ڈالتے رہتے ہیں اور ہر ایک سے کچھ نہ کچھ بٹور لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بجا طور پر ایک کامیاب دنیا دار سیاستدان سمجھے جاتے ہیں۔ دین کی خیر ہے وہ تو ان کی مساجد اور مدارس میں کافی پایا جاتا ہے۔

جماعت اسلامی

اس کے بھی صرف دو مزید دھڑے ہیں جو اس سے الگ ہو چکے ہیں یعنی تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی- مرحوم ڈاکٹر اسرار احمد جب تک زندہ تھے جماعت والوں کو جلی کٹی سناتے رہتے تھے لیکن ان کے جانشین بیٹے (یہ شرعی وراثت ہے اور جائز ہے) متحمل مزاج ہیں لہٰذا ’چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کی نوبت نہیں آتی۔

جماعت انتخابات میں ہمیشہ ہارتی ہی رہی ہے۔ آخری بار جب مئی ۲۰۱۳ء میں ہاری تو ہم نے جماعت کے حامی دانشوروں کے مضامین کا ایک مجموعہ ’جماعت اسلامی اور انتخابی سیاست‘ کے نام سے مرتب کر کے اہل جماعت کو بھجوایا جس میں اکثر دانشوروں نے کہا تھا کہ جماعت کو بنیادی فکری چیلنج درپیش ہے۔ یہ اقامت دین کی ایک اصولی اور عالم گیر تحریک تھی۔ اسے ایک سیاسی جماعت بنا دینا اور وہ بھی ناکام ایسے ہی ہے جیسے گلیور ٹریولز میں ایک دیو بونوں کے ملک میں چلا جاتا ہے لیکن ہماری بات شائد جماعت کی قیادت کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ ہماری مایوسی دیکھ کر ایک دوست نے کہا قصور آپ کا ہے، آپ کیوں بھینس کے آگے بین بجاتے ہیں؟ جو قیادت اس قابل ہو کہ مولانا مودودی کی کتابیں اُٹھا کر الماری میں رکھے تو واپس آ کر پوچھے کہ ’’تنقیہات‘ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ جمع مونث سالم ہے؟...... معاف کیجیے گا یہ جملہ غلطی سے زبان پر آ گیا کیونکہ انہوں نے تو عربی پڑھی ہی نہیں۔

تو خیر ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ دانشوروں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ تقسیم کار سے مدد لو۔ جماعت کو دعوت و تربیت اور اصلاح فرد و معاشرہ کا کام کرنے دو اور مغربی جمہوریت کے سیاسی چسکے کے لیے ایک سیاسی جماعت بھی ’سیاسی قائدین‘ کو بنا دو لیکن بات یار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی...... اور آئے گی بھی نہیں خواہ فرید پراچہ اور لیاقت بلوچ صاحب کے بعد اگلے انتخابات میں سراج الحق صاحب کی بھی ضمانت ضبط ہو جائے کیونکہ جس قیادت کا یہ حال ہو کہ اس نے ہماری تجویز پر (ہماری خوش فہمی دیکھیے کہ ہم سمجھ رہے ہیں کہ مذکورہ کتاب میں ہم نے جو لکھا تھا کہ جماعت کی قیادت اپنا احتساب نہیں کرتی اور ارکان (وہمدردان سے) موثر مشاورت نہیں کرتی تو اس کے جواب میں قیادت نے ایک طویل سوال نامہ تیار کرا کر ارکان کو بھجوایا ہے جس میں ایک بھی سوال کام کا نہیں اور جب سوال ہی کوئی کام کا نہیں تو کام کا جواب کہاں سے آئے گا؟ البتہ اس طرح اس سوال نامے کے مرتبین نے ہمارے اس مرحوم استاذ کا قول غلط ثابت کر دیا ہے جنہوں نے کہا تھا کہ ۹۸ فیصد لوگوں کو سوال کرنا نہیں آتا اور ۹۹ فیصد لوگوں کو جواب دینا نہیں آتا۔ کیونکہ مذکورہ سوال نامہ دراصل اس ذہانت سے مرتب کیا گیا ہے کہ جواب خواہ سب کی طرف سے

آ جائے اور کام کی بات خواہ اس میں ایک بھی نہ ہو تا کہ جماعت کے نئے قائد عزت مآب، عالی جناب، سابق سینئر وزیر سراج الحق صاحب کو ایک نئی 'تحریک پاکستان' چلانے کا موقع مل جائے خواہ اس تسمیے سے بانئ جماعت کی روح تڑپتی رہے (اچھرے میں...... منصورے میں تو نہیں نا) جو بچارے اصلی تحریک پاکستان کے وقت 'اسلام اور موجودہ سیاسی کشمکش' کے نام سے صفحے کے صفحے سیاہ کرتے رہے اور اس خواہ مخواہ کی تحریک کے بخیے ادھیڑتے رہے۔

'جہادی' گروپ

امریکہ، بھارت، ایران، سعودی عرب وغیرہ کے پیسے اور اسلحے سے جو دشت گردی مذہب اور مسلک کے حوالے سے ہمارے دینی گروپ پاکستان میں پھیلا رہے ہیں وہ کہیں باہر سے تو نہیں آتے۔ ہمارے دیوبندی اور شیعہ مدارس (اور اب ماشاءاللہ اہل حدیث بھی نو واردان عشق میں سے ہیں، سعودیہ کی 'برکت' سے) ہی کی پیداوار ہیں لیکن ہمارے مدارس اور مذکورہ بالا دینی جماعتیں ان کی مذمت کیوں نہیں کرتیں؟ انہیں اپنے مسالک میں سے خارج کیوں نہیں کرتیں؟

فرقہ واریت اور مسلک پرستی

مسائل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہماری مذہبی قیادت کا سب سے بڑا مسئلہ فرقہ واریت اور مسلک پرستی ہے۔ مسلک پرستی سے مراد ہے دین کو اپنے مسلک میں محصور سمجھنا اور اسے دین کی واحد صحیح تعبیر سمجھنا اور دوسرے مسالک کو باطل سمجھنا اور ان کی بیخ کنی کی کوشش کرنا۔ اس فرقہ واریت اور مسلک پرستی کو ہر گلی اور محلے میں کون لے کر گیا ہے؟ ظاہر ہے ہماری مساجد اور مدارس- سوال یہ ہے کہ ہماری مساجد اور مدارس کو فرقہ پرستی سے کیسے بچایا جائے؟ جب کہ ہر مسجد اور مدرسے کو وہ ایک مسلک کے نام سے رجسٹرڈ کراتے ہیں (اور حکومت رجسٹرڈ کرتی ہے) اس مدرسے میں کسی دوسرے مسلک کا طالب علم نہ پڑھ سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے مسلک کا عالم پڑھا سکتا ہے۔ ہر مسجد پر کسی نہ کسی مسلک والے مولوی صاحب کا قبضہ ہوتا ہے۔ ہر دینی سیاسی جماعت انہوں نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق بنائی ہوئی ہے تا کہ وہ نا کام ہو جائے...... کیونکہ ظاہر ہے جب سیاسی جماعت انہوں نے مسلک کے نام پر بنائی ہے تو انہیں پتہ ہے کہ دوسرے مسلک والے اسے ووٹ نہیں دیں گے تو ظاہر ہو گیا کہ وہ سیاسی جماعت مسلک کی بنیاد پر اسی لیے بناتے ہیں تا کہ وہ نا کام ہو جائے۔ وہ عجیب سادہ لوح ہیں، سمجھتے ہیں کہ یہ سارے کام انہوں نے کیے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خفیہ ایجنسیوں نے ان سے کرائے ہیں۔ بس اخلاص اور فراست کی کمی کا ذرا سا مسئلہ ہے باقی تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

دینی مدارس اوران کے وفاق

ہاں تو ہم دینی حلقوں میں انتشار وافتراق اورفرقہ واریت ومسلک پرستی کی بات کررہے تھےتو ہمیں دینی مدارس اوران کے وفاق تو بھولتے ہی جارہے تھے، اچھا ہوایاد آ گئے۔

پچھلے دنوں اخبارات میں دیکھا کہ وفاق تنظیم المدارس میں قیادت پر جھگڑا ہوا۔ ایک گروپ نے جعلی انتخاب کرواکر وفاق پر قبضہ کرلیا، دوسرا عدلت جا پہنچا۔ شکر ہے بات ڈنڈے سوٹے تک نہیں پہنچی جیسا کہ مساجد پر قبضے میں اکثر پہنچ جاتی ہے۔ یہی حال دوسرے وفاقوں کا ہے۔ وفاق المدارس السّلفیہ پر عرصے سے ساجد میر صاحب (کے گروپ) کا قبضہ ہے جب کہ دوسرے گروپ تلملاتے رہتے ہیں۔ مشہور صحافی عرفان صدیقی صاحب (جوآج کل وزیراعظم صاحب کی ناک کا بال بنے ہوئے ہیں) چند سال پہلے مسلسل مضمون لکھ کر یہ ثابت کرتے رہے کہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب اور قاری محمد حنیف جالندھری صاحب سرکار دربار کے آدمی ہیں۔ دروغ برگردن راوی لیکن پہلے صاحب وفاق تنظیم المدارس کے (متنازعہ) صدر ہیں اور دوسرے صاحب وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ وفاق المدارس العربیہ میں ان کے مخالفین کا کہنا ہے کہ اس وفاق پر بھی ایک گروپ کا قبضہ ہے اور صدر و ناظم اعلیٰ طویل برسوں سے اپنے عہدوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور بیماری وکمزوری اور کام نہ کر سکنے کے باوجود کسی دوسرے کو خدمت کا موقع نہیں دے رہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کی ذمہ داری ہے کہ وہ دینی تعلیم کے وفاقوں کو ان قبضہ گروپوں سے چھڑائے اور انہیں بھلے طریقے سے کام کرنے کا موقع دے۔

وفاقوں کا یہ پورا نظام اصلاح طلب ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی بنیاد مسلک پرستی پر کیوں رکھی گئی ہے؟ سیدھے سبھاؤ ایک وفاق ہونا چاہیے جس کے دو حصے ہوں ایک اہل السنہ کا اور دوسرا اہل تشیع کا۔ سنی مدارس کا نصاب ایک ہونا چاہیے (اب بھی تقریباً ایک ہی ہے) کتابیں البتہ دوسری رکھی جاسکتی ہیں اور یہ وفاق کسی مسلک کی تحویل میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ جس طرح حکومت کے زیرانتظام دوسرے تعلیمی بورڈ کام کررہے ہیں، اس بورڈ کو بھی ویسے ہی غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر کام کرنا چاہیے۔

یہ چند باتیں ارتجالاً نوک قلم پر آ گئیں امید ہے دینی حلقے وسعت قلبی سے کام لیتے ہوے ان پر غور وتدبر فرمائیں گے۔ اگر اس تحریر میں کچھ ایسی باتیں آ گئی ہوں جو انہیں ناگوار ہوں تو امید ہے وہ درگزر سے کام لیں گے کہ ہماری نیت اصلاح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان دینی عناصر کو اتحاد واتفاق کی دولت سے نوازے اوران سے امت کی اصلاح کا کام لے اور انہیں (اور ہمیں) نفس اور شیطان کے شر سے بچائے، آمین یارب العالمین۔

پاکستانیات **افتخار الدین منصور**

موجودہ حالات میں
نجات کی راہ کیا ہے؟

افتخار الدین منصور صاحب ایک ریٹائرڈ انجینئر ہیں۔ ملت کا درد رکھتے ہیں۔ سوچتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں اور بہت اچھا تجزیہ کرتے ہیں ان کی ایک تحریر کہ قوم کو تعلیم یافتہ کیسے بنایا جائے؟ دو قسطوں میں البرہان میں طبع ہوئی تھی۔ زیر نظر تحریر ۶۴ صفحات کا ایک کتابچہ ہے جس میں انہوں نے موجودہ حالات کی خرابیوں اور کمزوریوں کا، ان کے اسباب کا اور ان کے علاج کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ ہم نے جب بھی اسے ہاتھ میں لیا دل چاہا کہ اسے پورے کا پورا البرہان میں دے دیں لیکن ۵۶ صفحات کے ایک ماہنامے کی مجبوریاں اپنی جگہ ہیں۔ آپ اسے بلا قیمت مصنف سے طلب کر سکتے ہیں (رابطہ: مکان نمبر ۴۲، جے ۲، واپڈا ٹاؤن، لاہور فون ۰۴۲-۵۱۸۳۴۴۲ و ۰۳۲۱-۴۹۶۲۵۷۰)۔ ہم اس کتابچے کی بحث کا اختتامیہ کہ موجودہ حالات کی اصلاح کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے، یہاں دے رہے ہیں۔ مدیر

کرنے کے کام

۱- سب سے پہلے ایک ہمہ گیر تحریک بیداری شروع کرنے کی ضرورت ہے جو قوم کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کو متحد کر کے آمادۂ عمل کر سکے کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

۲- دوسرا کرنے کا کام یہ ہے کہ قوم کے ہر شخص، مرد و عورت کو زیور تعلیم سے آراستہ کر دیا جائے۔ ہم اگر گھاس کھا کر بھی سو فیصد تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں تو ہمیں گھاس کھانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ ہمیں اپنی ہر آسائش کو قربان کر کے قوم کے ہر بچہ کو مدرسہ میں لے جانا چاہیے۔ بات ہو سکنے یا نہ ہو سکنے کی نہیں، بات ارادہ کر لینے کی ہے۔ پختہ ارادوں کو تو سنگلاخ چٹانیں بھی راہ دے دیا کرتی ہیں۔ جب کوئی قوم ایک راہ پر نکل پڑتی ہے تو ایسی ایسی راہیں کھلتی ہیں جن کے بارے میں پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے کام تدریج سے نہیں ہوا کرتے، نہ دلیلوں پر انہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔ ایسے کام صرف ایک جست سے ممکن ہوا کرتے ہیں۔ اس دوران یا بعد میں مسائل کیسے بھی پیدا ہوں، ایک جاہل انبوہ کی بجائے ایک پڑھی لکھی

قوم انہیں حل کرنے کی بہتر اہلیت رکھتی ہوگی۔

۳- تعلیم کا نصاب ساری قوم کے لیے ایک ہونا چاہیے اور معیار تعلیم بھی، صدر کا بیٹا اور مزدور کا بیٹا دونوں ایک ہی طرز کے تعلیمی ماحول سے نکلیں گے موجودہ حالات میں یہ امر محض تصوراتی محسوس ہوتا ہے لیکن جب قوموں کے ضمیر بیدار ہوتے ہیں تو کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔

۴- (i) انگریزی بین الاقوامی زبان ہونے کے علاوہ مروج علوم کی زبان بھی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو ہمارے روزمرہ کاروبار کے لیے ہماری اپنی زبانیں کافی ہیں۔

(ii) ننانوے فیصد لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے ملک میں کام کرنا ہوتا ہے، جن کے لیے ان کی اپنی زبانیں کافی ہیں۔

(iii) ساری قوم کو انگریزی پڑھا کر ہر ایک سے یہ امید رکھنا کہ وہ اعلیٰ علوم سے خود استفادہ کرے گا، ایک ناقابل عمل بات ہے۔ نہ ایسا کبھی اور کہیں ہوا ہے نہ اب ہوگا۔ قابل عمل بات یہی ہے کہ علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا جائے اور ہر طبقہ کو اس کی ضرورت کے مطابق معلومات بہم پہنچائی جائیں۔

(iv) صرف وہ اصحاب جو اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے میدان میں کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا کی علمی زبانوں کا جاننا ضروری ہوگا۔ ان کے لیے اعلیٰ قسم کی زبان دانی کے ادارے قائم کیے جا سکتے ہیں جن کی مدد سے ایک ذہین شخص کے لیے ایک سال میں کسی بھی زبان پر عبور حاصل کر لینا مشکل نہ ہوگا۔

(v) بڑے بڑے تراجم کے مراکز قائم کر کے تمام علوم کی نمائندہ کتابوں اور رسائل کو اپنی زبان میں منتقل کر دیا جانا چاہیے۔ ہمارے طلبا مغربی جامعات میں جا کر ان کے علوم رٹنے کے بجائے اپنے ہاں علم کی روایت کو آگے بڑھائیں گے۔

(vi) تراجم کے سلسلہ میں اصطلاحات کے مسئلہ کو مشکل پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ خود انگریزی کے پاس اپنی اصطلاحات کتنی ہیں؟ یہ ایک چھوٹے سے علاقہ کی غیر ترقی یافت زبان تھی جسے طاقت کی بنیاد پر اتنا پھیلا دیا گیا۔ انہوں نے اکثر اصطلاحات لاطینی وغیرہ زبانوں سے حاصل کیں، ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس تو عربی ایک ایسی زبان ہے جو اصطلاحات سازی کے لیے خاص طور پر معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

(vii) عباسی دور میں بھی اس وقت کے رائج علوم کے تراجم ہوئے جس کی وجہ سے ہمارے اعتقادات میں رخنہ اندازی ہوئی لیکن وہ ہمارے ہاں روایت علم کی ابتدا تھی۔ اب وہ بات نہیں، ایک تو ہم نے ان علوم کو (خصوصاً فلسفیانہ افکار کو) خوب کھنگال لیا ہے، دوسرے ان فلسفوں کی بنیاد پر عیسائی

تہذیب وثقافت کے تجربات وثمرات ہمارے سامنے ہیں۔ ہم یقیناً اس بار پہلے سے زیادہ بالغ نظری کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

(viii) جدید علوم کی آبیاری خدا بیزاری کی بنیادی پر ہوئی ہے لیکن ہمیں بددیانتی اور جانبداری میں ملوث ہوئے بغیر خداداری کی بنیاد پر علوم کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنا ہوگا۔

۵- قرآن کی زبان اور قرآن ہمارے نظام تعلیم کا جزو لاینفک ہے۔ قرآن کو ہمیں خواص سے نکال کر عوام کے سپرد کرنا ہے، تبھی یہ ہمارے اعمال کی بنیاد بن سکے گا۔

۶- سائنسی علوم کے بارے میں ہمارے ہاں کبھی اختلاف نہیں رہا۔ ویسے بھی سائنس کا تعلق طبعی حقائق کے تجزیاتی مطالعہ سے ہے۔ خود قرآن نے نہ صرف یہ کہ ایسے مطالعہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ جگہ جگہ تخلیقی حقائق پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس کے علاوہ اب تک کے سائنسی حقائق اور قرآن کے طبیعی حقائق کی طرف اشارات میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

۷- ایک بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ 'معیشت' باہر سے درآمد نہیں کی جا سکتی، نہ معاشی نظام کھڑے کرنے سے معیشتیں استوار ہوتی ہیں۔ جو کوئی بھی میدان کارزار میں اترتا ہے، معیشت اس کا پہلا شکار ہوتی ہے۔ جب ہم اعتماد سے اپنے قدم بڑھائیں گے وسائل آگے بڑھ کر ہمارے قدم چومیں گے۔ دوسروں سے وسائل غلام حاصل کرتے ہیں۔ جو لوگ میدان عمل میں اترنے کے لیے وسائل کا انتظار کرتے ہیں وہ ساری عمر اسی انتظار میں بِتا دیتے ہیں۔

نصف صدی ہم نے گنوا دی
تحفظ کے لیے مغربی اقوام کا سہارا ڈھونڈا
معیشت کے لیے قرضوں کو حاجت روا جانا، اور
حصول علم کے لیے انگریزی کی بیساکھی تلاش کی۔
لیکن دنیا میں ان تینوں میدانوں میں ہمارا کوئی مقام ہی نہیں۔
نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔

آیئے دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے ایک نظر اپنے آپ پر ڈال لیں، ہم اپنے ماضی حال اور مستقبل کا جائزہ لے لیں اور جو کچھ ہو سکتا ہے اس کے لیے ایں و آں کا انتظار کیے بغیر میدان عمل میں اتر آئیں اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کسی شک میں مبتلا نہ ہوں۔

مَن قَرَع بابًا وَلجَّ ......وَلَجَ.

(جس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اصرار کیا......وہ داخل ہو گیا)